بسم اللہ الرحمن الرحیم

$3

اسلامی تعلیمات

مولانا وحید الدین خاں

مکتبہ الرسالہ ، نئی دہلی

ISBN 81-85063-82-6 (PB)
ISBN 81-85063-83-4 (HB)

مطبوعات اسلامی مرکز

ناشر : مکتبہ الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی ۱۳ فون: 697333. 611128
سال اشاعت : ۱۹۸۷ء
مطبوعہ : راہل آفسٹ پرنٹرز دہلی

فہرست

آغاز کلام

ہر آدمی کی ایک سوچ ہوتی ہے جس کے تحت وہ زندگی اور کائنات کے بارے میں رائے قائم کرتا ہے۔ پھر اسی سوچ کے مطابق وہ کسی چیز کو سب سے اونچی جگہ دیتا ہے اور اس کو اپنی عقیدتوں اور توجہات کا مرکز بناتا ہے۔ پھر اسی کے مطابق وہ ماحول کے اندر اپنا عمل کرتا ہے۔ ان تینوں چیزوں کو عقیدہ، عبادت اور کردار کہہ سکتے ہیں۔ انھیں تینوں چیزوں کے مجموعہ کا نام دین ہے اور اس اعتبار سے ہر آدمی کا کوئی نہ کوئی دین ہوتا ہے، خواہ وہ خدا پرست ہو یا غیر خدا پرست۔

اسلام یہ ہے کہ آدمی اس حقیقتِ واقعہ کو پالے کہ اس دنیا کے پیچھے ایک قادر مطلق کا ارادہ کام کر رہا ہے۔ وہی اس کا خالق و مالک ہے۔ اسی کے یہاں ہر ایک کا حساب وکتاب ہونے والا ہے۔ صحیح وہ ہے جو اس کے نزدیک صحیح ٹھہرے اور غلط وہ ہے جو اس کے یہاں غلط قرار پائے۔

اس حقیقت کا پانا کسی ریاضیاتی فارمولے کا پانا نہیں ہے۔ وہ بندے کا اپنے خدا کو پانا ہے۔ یہ "بے کچھ" کا "سب کچھ" کو پالینا ہے۔ اس لئے جو آدمی اس حقیقت کو پالے وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ ایک اور ہی انسان بن جاتا ہے۔ اس کی زندگی ایک ربانی سمندر میں نہا اٹھتی ہے۔ یہ ایک ایسی دریافت ہوتی ہے جو اس کے دل و دماغ کو پوری طرح اپنی

پکڑ میں لے لیتی ہے۔ اس کا دیکھنا اور سننا خدا کی نظر سے دیکھنا اور سننا بن جاتا ہے۔ اس کے فکر وخیال کی دنیا اگر اب تک تاریک تھی تو اب اس کے اندر ایک نیا آفتاب جل اٹھتا ہے جو اس کی پوری ہستی کو روشن کر دیتا ہے۔

اس نفسیاتی یافت کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہمہ تن خدا کا ہو جاتا ہے۔ وہ اس کی یاد میں جینے لگتا ہے۔ وہ اپنی ہستی کو اس کے مقابلہ میں کھو دیتا ہے۔ وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ اس کے آگے جھک جاتا ہے۔

پھر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانوں کے درمیان اس کا سلوک ایک بندۂ خدا کا سلوک بن جاتا ہے۔ جہاں لوگ انانیت دکھاتے ہیں وہاں وہ متواضع بن جاتا ہے۔ جہاں لوگ انتقامی کارروائی کرتے ہیں وہاں وہ معاف کر دیتا ہے۔ جہاں لوگ ظلم پر اتر آتے ہیں وہاں وہ انصاف پر قائم رہتا ہے۔ جہاں لوگ اپنی ذات کے لئے کٹ جاتے ہیں وہاں وہ حق کی خاطر جڑ جاتا ہے۔ جہاں لوگ خود پاکر مطمئن ہو جاتے ہیں وہاں وہ دوسروں کو دینے کی فکر کرتا ہے۔ جہاں لوگ دنیا کی رونقوں کی طرف دوڑتے ہیں وہاں وہ آخرت کی چھپی ہوئی دنیا میں اپنے کو گم کر دیتا ہے ——— یہی وہ سچی زندگی ہے جو پیغمبر کے ذریعہ انسان کو بتائی گئی ہے۔

جو لوگ اس طرح ایک خدا کو اپنا لیں وہ فطری طور پر باہم جڑ کر ایک ہو جاتے ہیں۔ وہ اس بھلائی کو دوسروں تک بھی پہنچانے لگتے ہیں جس کو انھوں نے اپنے لئے اختیار کیا ہے۔ ان کی باہر کی زندگی ان کی اندرونی زندگی کا عکس بن جاتی ہے۔

کوئی آدمی دولت کے لئے جیتا ہے، کوئی عزت کے لئے، کوئی اقتدار کے لئے۔ ہر آدمی، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، کسی نہ کسی چیز میں جی رہا ہے۔ ہر آدمی کی زندگی میں

کوئی ایسی چیز ہوتی ہے جس کے سہارے وہ زندہ ہو۔ جس کو وہ سب سے زیادہ قابل لحاظ سمجھے۔ جس کو حاصل کرنے کا خواب دیکھے۔ جس کے لئے دوڑ دھوپ کرے۔ اس کی امیدیں اور اس کے اندیشے، اس کی تمنائیں اور اس کی حسرتیں سب سے زیادہ اس سے وابستہ ہوں۔ اس کو پاکر وہ سب سے زیادہ خوش ہو اور اس کے چھننے کا ڈر ہو تو وہ سب سے زیادہ غمگین ہو جائے۔

یہی دین ہے۔ اس معنیٰ میں ہر شخص کا ایک دین ہوتا ہے۔ کوئی بھی شخص اس قسم کے ایک دین سے خالی نہیں۔ آدمی جس چیز کو اپنا "دین" بنائے اسی کے مطابق اس کی پوری زندگی بنتی ہے۔ اس کی سوچ اور جذبات، اس کا لین دین، اس کے انسانی تعلقات، اس کی سرگرمیاں اور کارروائیاں سب اسی کے گرد گھومتی ہیں۔ وہ اس کام کو کرتا ہے جس سے اس کا مقصود ملنے والا ہو، اس کام سے دور بھاگتا ہے جس سے اپنے مقصود کو نقصان پہنچ جانے کا اندیشہ ہو۔ یہی دین اس کا حاکم ہوتا ہے۔ سوتے جاگتے ہر حال میں وہ اسی دین کو پکڑے رہتا ہے۔ اس کی زندگی کا کوئی گوشہ اس کے اثر سے خالی نہیں ہوتا۔

یہ دین خدا کا بھی ہو سکتا ہے اور غیر خدا کا بھی۔ موجودہ دنیا میں یہی امتحان ہے کہ آدمی کون سا دین اختیار کرتا ہے۔ خدا کا یا غیر خدا کا۔ یہاں ہر شخص کو آزادی ہے۔ یہاں غیر خدا کے دین کو پکڑ کر بھی آدمی عزت اور کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔ مگر یہ کامیابی بالکل وقتی ہوگی۔ وہ زیادہ سے زیادہ موت تک آدمی کا ساتھ دے گی۔ اس کے بعد اگلی مستقل دنیا میں وہ اس حال میں اٹھے گا کہ وہ بالکل خالی ہاتھ ہوگا۔ اگلی دنیا میں خدا اپنے قدرت اور جلال کے ساتھ ظاہر ہو چکا ہوگا۔ اس لئے وہاں عزت اور کامیابی

صرف اس شخص کے لئے ہوگی جس نے موجودہ دنیا میں خدا کے دین کو اپنا دین بنایا ہوگا۔ جو کسی دوسرے دین کو اختیار کرے گا، اس کے لئے موت کے بعد آنے والی دنیا میں ناکامی و بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

خدا کا دین ہی انسان کے لئے فطری اور حقیقی دین ہے۔ یہ حقیقت ڈر کے لمحات میں کھل جاتی ہے۔ آدمی خواہ کوئی بھی دین اختیار کرے۔ خواہ وہ کوئی بھی سہارا پکڑے، مگر جب انسان کی زندگی کا جہاز کسی بھنور میں پھنستا ہے، جب اس پر کوئی نازک لمحہ آجاتا ہے، اس وقت اس کو تمام چیزیں بھول جاتی ہیں۔ اس وقت وہ بے اختیار ہو کر ایک خدا کو پکارنے لگتا ہے۔ یہ تجربہ جو کبھی نہ کبھی ہر شخص کی زندگی میں گزرتا ہے، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ حقیقی دین صرف خدا کا دین ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ اسی کو اپنی زندگی کا دین بنائے۔ اس کے سوا وہ جس دین کو بھی پکڑے گا وہ وقت آنے پر اسی طرح بے حقیقت ثابت ہوگا جیسے آج نازک لمحات میں تمام چیزیں بے حقیقت ثابت ہو جاتی ہیں۔ آج کے حالات میں فطرت کی پکار آئندہ آنے والی مستقل دنیا کا ایک اشارہ ہے۔ وہی شخص کامیاب ہے جو اس اشارہ پر کان لگائے اور اپنی زندگی کو اس کے مطابق بنالے۔

بنیادی مسئلہ
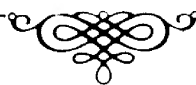
بنیادی مسئلہ

اگر کسی مجلس میں یہ سوال اٹھایا جائے کہ آج انسان کا سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے تو مختلف لوگ اس کا مختلف جواب دیں گے۔ کوئی کہے گا کہ سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ایٹمی ہتھیاروں کا تجربہ بند کیا جائے، کوئی دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی کو سب سے بڑا مسئلہ قرار دے گا۔ کوئی کہے گا کہ پیداوار اور تقسیم کے نظام کو درست کرنا یہ موجودہ انسان کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ غرض طرح طرح کے جوابات سنائی دیں گے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان ابھی انسان کو نہیں جانتا۔ اگر وہ اپنے آپ کو جانتا تو سب کے جوابات ایک ہوتے۔ سب یہ کہتے کہ آج انسان کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ انسان اپنی حقیقت کو بھول گیا ہے۔ وہ اس حقیقت سے غافل ہے کہ اسے ایک روز مرنا ہے اور مرنے کے بعد اپنے مالک کے پاس حساب کتاب کے لیے جانا ہے۔ اگر ہم زندگی کی حقیقت کو سمجھ لیں تو ہم دنیا کو نہیں بلکہ آخرت کو اپنا اصل مسئلہ قرار دیں گے۔

آج بھی دنیا کے بیشتر انسان خدا اور آخرت کو مانتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ اس کے منکر ہو گئے ہوں۔ مگر اس ماننے کا کوئی تعلق ان کے عمل سے نہیں ہے۔ حقیقی زندگی میں ہر شخص کے سامنے صرف یہ سوال ہے کہ وہ اپنی آج کی دنیا کو کس طرح کامیاب بنائے۔ اگر ہماری

رصدگاہیں کسی روز یہ اعلان کر دیں کہ زمین کی قوت کشش ختم ہو گئی ہے اور وہ چھ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سورج کی طرف کھنچی جا رہی ہے تو ساری دنیا میں کہرام مچ جائے گا۔ کیونکہ اس طرح کی ایک خبر کے معنیٰ یہ ہیں کہ چند ہفتوں کے اندر روئے زمین سے ہر قسم کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔

مگر یہ دنیا ہر آن ایک اس سے زیادہ شدید خطرے سے دوچار ہے اور کوئی نہیں جو اس سے گھبرانے کی ضرورت محسوس کرتا ہو۔ یہ خطرہ کیا ہے! یہ قیامت کا خطرہ ہے جو زمین و آسمان کی پیدائش کے روز ہی سے اس کے لیے مقدر ہو چکا ہے۔ اور جس کی طرف ہم سب لوگ نہایت تیزی سے دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ عقیدہ کی حد تک سبھی لوگ اس کو تسلیم کرتے ہیں۔ مگر ایسے لوگ بہت کم ہیں جو فی الواقع اس کے بارے میں سنجیدگی سے کچھ سوچنے کی ضرورت محسوس کرتے ہوں۔

اگر آپ شام کے وقت کسی کھلے ہوئے بازار میں کھڑے ہو جائیں اور وہاں دیکھیں کہ لوگ کس لیے بھاگ دوڑ کر رہے ہیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ آج کے انسان کس چیز کو اپنا اصل مسئلہ بنائے ہوئے ہیں۔ ذرا تصور کیجئے بھرے ہوئے بازار میں موٹروں کی آمد و رفت کس لیے ہو رہی ہے، دکان دار کس لیے اپنی دکانیں سجائے ہوئے بیٹھے ہیں۔ انسانوں کے غول کے غول کہاں آتے جاتے نظر آتے ہیں۔ لوگوں کی بات چیت کا موضوع کیا ہے اور ایک دوسرے کی ملاقات کس غرض سے ہو رہی ہے، کن چیزوں سے لوگ دل چسپی لے رہے ہیں۔ ان کی بہترین صلاحیتیں اور ان کی جیب کے پیسے کس مقصد کے لیے خرچ ہو رہے ہیں۔ جو خوش ہے وہ کیا چیز پا کر خوش ہے اور جو چہرے اداس نظر آتے ہیں، کس چیز کی محرومی نے انہیں اداس بنا دیا ہے۔ لوگ اپنے گھروں سے کیا چیز لے کر نکلے ہیں اور کیا چیز لے کر واپس

جانا چاہتے ہیں۔ اگر آپ لوگوں کی مصروفیتوں سے، ان کے منھ سے نکلی ہوئی آوازوں سے، ان کی مختلف حرکات و سکنات سے ان سوالات کا جواب معلوم کرسکیں تو اسی سے آپ کو اس سوال کا جواب بھی معلوم ہو جائے گا کہ آج کا انسان کس چیز کو اپنا اصل مسئلہ سمجھتا ہے اور کیا حاصل کرنا چاہتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بازاروں کی چہل پہل اور مصروف ترین سڑکوں پر انسانوں کی مسلسل آمد و رفت پکار رہی ہے کہ آج کا انسان اپنی خواہشوں کے پیچھے دوڑ رہا ہے۔ وہ آخرت کو نہیں بلکہ صرف دنیا کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اگر وہ خوش ہے تو اس لیے خوش ہے کہ اس کی دنیوی تمنائیں پوری ہو رہی ہیں۔ اگر وہ غمگین ہے تو اس لیے غمگین ہے کہ اس کی دنیوی خواہشیں پوری ہوتی ہوئی نظر نہیں آتیں۔ آج کی ضرورتیں، آج کا آرام، آج کی عزت، آج کے مواقع، بس انہیں کو پالینے کا نام لوگوں کے نزدیک کامیابی ہے۔ اور انہیں سے محروم رہنے کا نام لوگوں کے نزدیک ناکامی۔ یہی وہ چیز ہے جس کے پیچھے سارا انسانی قافلہ بھاگا چلا جا رہا ہے۔ کسی کو بھی آنے والے دن کی فکر نہیں۔ ہر شخص بس آج کے پیچھے دیوانہ ہو رہا ہے۔

صرف بڑے بڑے شہروں کا یہ حال نہیں ہے بلکہ جہاں بھی چند انسان بستے ہیں اور کچھ چلتے پھرتے لوگ موجود ہیں، ان سب کا یہی حال ہے۔ آپ جس کسی کو دیکھئے وہ اسی کے خیال میں ڈوبا ہوا نظر آئے گا۔ مرد ہو یا عورت، امیر ہو یا غریب، بوڑھا ہو یا جوان، جاہل ہو یا عالم، شہری ہو یا دیہاتی حتیٰ کہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی سب کے سب اسی ایک سمت میں بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ آج آدمی کی سب سے بڑی تمنا صرف یہ ہے کہ دنیا میں وہ جتنا کچھ حاصل کرسکتا ہے حاصل کرلے۔ اسی کو وہ اپنے لیے "کام" سمجھتا ہے۔ اسی کے لیے اپنے بہترین اوقات

اور بہترین صلاحیتوں کو صرف کرتا ہے ۔ اسی کی فکر میں رات دن مشغول ہے ۔ حد یہ ہے کہ اگر ضمیر اور ایمان کو قربان کرکے یہ چیز ملے تو وہ اپنا ضمیر اور ایمان بھی اس دیوی کی نذر کرنے کے لیے تیار ہے ۔ وہ دنیا کو حاصل کرنا چاہتا ہے خواہ وہ جس طرح بھی ملے ۔

مگر اس طرح کی ہر کامیابی صرف دنیا کی کامیابی ہے ۔ آخرت میں وہ بالکل کام نہیں دے سکتی ۔ جو شخص صرف اپنی آج کی دنیا بنانے کی فکر میں ہے اور آخرت کی طرف سے غافل ہے ۔ اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو اپنی جوانی میں اپنے بڑھاپے کے لیے جمع نہیں کرتا ۔ یہاں تک کہ جب اس کی قوتیں جواب دے دیتی ہیں اور وہ کام کرنے سے معذور ہو جاتا ہے ۔ تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ اب اس کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے ۔

وہ دیکھتا ہے کہ میرے پاس مکان نہیں ہے مگر اب وہ اپنا مکان نہیں بنا سکتا ۔ وہ دیکھتا ہے کہ اس کے پاس موسموں سے بچنے کے لیے کپڑا اور بستر نہیں ہے مگر اب اس میں اتنی سکت نہیں ہے کہ وہ اپنے لیے کپڑا اور بستر مہیا کر سکے ۔ وہ دیکھتا ہے کہ اس کے کھانے کا کوئی انتظام نہیں ہے مگر اب وہ اپنے کھانے کے لیے کچھ نہیں کر سکتا ۔ وہ حسرت کے ساتھ کسی دیوار کے سایہ میں چیتھڑا لپیٹے ہوئے پڑا رہتا ہے جس پر کتے بھونکتے ہیں اور لڑکے کنکریاں مارتے ہیں ۔ ہم اپنی آنکھوں سے اس طرح کی مثالیں دیکھتے ہیں جس سے ایک ہلکا اندازہ ہو سکتا ہے کہ آخرت کی کمائی نہ کرنے والے کے لیے آخرت کی زندگی کیسی ہوگی ۔ مگر اس کے باوجود ہمارے اندر کوئی کھلبلی پیدا نہیں ہوتی ۔ ہم میں کا ہر شخص صرف اپنے آج کی تعمیر میں مصروف ہے وہ اپنے کل کی کوئی فکر نہیں کرتا ۔

جنگ کے زمانے میں جب ہوائی حملے کا سائرن بجتا ہے اور اپنی مہیب آواز سے یہ اعلان کرتا ہے کہ " دشمن کے ہوائی جہاز آتشیں بموں کو لیے ہوئے غول در غول چلے آرہے ہیں

مستقبل محفوظ کرنے کے لیے تو وہ ساری عمر لگا دیتے ہیں مگر جو مستقبل خود ان کے سامنے آنے والا ہے اس کی تعمیر کے لیے کوئی کوشش نہیں کرتے۔ گویا ان کے مرنے کے بعد صرف ان کے بچوں کا وجود باقی رہے گا، خود ان کا کوئی وجود نہ ہوگا جس کے لیے انہیں تیاری کرنے کی ضرورت ہو۔

اس انداز میں لوگوں کا سوچنا یہ بتاتا ہے کہ انہیں شاید اس کا احساس نہیں ہے کہ مرنے کے بعد بھی ایک زندگی ہے بلکہ اصل زندگی مرنے کے بعد ہی شروع ہوتی ہے۔ اگر انہیں اس بات کا یقین ہوتا کہ مر کر جب وہ قبر میں دفن ہوتے ہیں تو درحقیقت وہ دفن نہیں ہوتے بلکہ ایک دوسری دنیا میں داخل کر دیئے جاتے ہیں۔ تو وہ بچوں کے مستقبل کے بارے میں فکرمند ہونے سے پہلے یہ سوچتے کہ "مرنے کے بعد میرا کیا انجام ہوگا"۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا کا بیشتر انسان خواہ وہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی، اس یقین سے خالی ہو گیا ہے کہ وہ مرنے کے بعد ختم نہیں ہو جاتا بلکہ نئی زندگی حاصل کرتا ہے۔ ایک ایسی زندگی جو موجودہ زندگی سے زیادہ حقیقی ہے، جو موجودہ زندگی سے زیادہ اہم ہے۔

موت کے بعد آنے والی زندگی کے بارے میں شبہہ دو وجہوں سے پیدا ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ ہر انسان مر کر مٹی میں مل جاتا ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ انسان مر کر ختم ہو گیا تو ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ دوبارہ کس طرح زندگی پائے گا۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ موت کے بعد جو دنیا ہے وہ ہم کو نظر نہیں آتی۔ آج کی دنیا کو تو ہر شخص اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے مگر اس کے بعد والی دنیا کو اب تک کسی نے نہیں دیکھا۔ اس لیے ہم کو یقین نہیں آتا کہ اس زندگی کے بعد بھی کوئی زندگی ہو سکتی ہے۔ آیئے ان دونوں سوالوں پر غور کریں۔

موت کے بعد زندگی

"جب میں مرکر مٹی ہو جاؤں گا تو کیا مجھے دوبارہ اٹھایا جائے گا" اس سوال کو اس طرح متعین کر کے تو بہت کم لوگ سوچتے ہیں مگر ہر وہ شخص جو اس بات پر گہرا یقین نہیں رکھتا کہ مرنے کے بعد اسے ایک نئی زندگی سے سابقہ پیش آنے والا ہے، اس کے ذہن میں ضرور یہ سوال دبا ہوا رہتا ہے۔ جو شخص آج کی زندگی میں کل کی زندگی کے لیے فکرمند نہیں ہے وہ اس بات کا ثبوت پیش کر رہا ہے کہ وہ کل کی زندگی کے متعلق شبہہ میں مبتلا ہے۔ خواہ وہ باقاعدہ اس مسئلے پر سوچتا ہو یا نہ سوچتا ہو۔

لیکن اگر ہم سنجیدگی سے غور کریں تو نہایت آسانی سے اس کی حقیقت سمجھ سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اگرچہ موت کے بعد پیش آنے والی حقیقتوں کو ہماری نگاہوں سے چھپا دیا ہے کیوں کہ وہ ہمارا امتحان لے رہا ہے، مگر کائنات میں ایسی بے شمار نشانیاں پھیلادی گئی ہیں جن پر غور کر کے ہم تمام حقیقتوں کو سمجھ سکتے ہیں۔ یہ کائنات ایک آئینہ ہے جس میں دوسری دنیا کا عکس نظر آتا ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ ہم اپنی موجودہ شکل میں اول روز سے موجود نہیں ہیں۔ انسان کی ابتدا ایک بے شکل حقیر مادّے سے ہوتی ہے جو ماں کے پیٹ میں بڑھ کر انسانی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اور پھر باہر آکر مزید ترقی کر کے پورا انسان بن جاتا ہے۔ ایک بے شعور اور حقیر مادہ جو اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ خالی آنکھ سے دیکھا نہیں جا سکتا، اس کا بڑھ کر چھ فٹ لمبا انسان بن جانا ایک ایسا واقعہ ہے جو روزانہ اس دنیا میں پیش آتا ہے۔ پھر یہ سمجھنے میں آپ کو کیا دقّت پیش آتی ہے کہ ہمارے جسم کے اجزا جو نہایت چھوٹے چھوٹے ذرّات بن کر زمین میں منتشر ہو جائیں گے، دوبارہ وہ پورے انسان کی شکل اختیار کر سکتے ہیں۔

ہر انسان جس کو آپ آج چلتا پھرتا دیکھتے ہیں وہ دراصل انسان کی شکل میں بے شمار ایٹم ہیں جو پہلے ہماری زمین اور ہماری فضا کے اندر نامعلوم وسعتوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ پھر ہَوا، اور پانی اور خوراک نے ان ایٹموں کو لاکر ایک انسانی وجود میں اکھٹا کر دیا اور اب ہم انہیں منتشر ایٹموں کے مجموعے کو ایک چلتے پھرتے انسان کی شکل میں دیکھ رہے ہیں۔ یہی عمل دوبارہ ہوگا۔ ہمارے مرنے کے بعد ہماری زندگی کے اجزا ہوا اور پانی اور زمین میں منتشر ہوجائیں گے اور اس کے بعد جب خدا کا حکم ہوگا تو وہ اسی طرح اکٹھا ہوکر ایک وجود کی شکل میں مجسّم ہو جائیں گے جس طرح وہ پہلی بار مجسّم ہوئے تھے۔ ایک واقعہ جو ہوچکا ہے وہی اگر دوبارہ ظہور میں آئے تو اس میں تعجّب کی کون سی بات ہے۔

خود مادّی دنیا میں ایسی مثالیں موجود ہیں جو اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ زندگی کو دوسری بار دُہرایا جا سکتا ہے۔ ہر سال برسات میں ہم دیکھتے ہیں کہ زمین میں سبزہ اُگتا ہے اور ہر طرف ہریالی پھیل جاتی ہے پھر گرمی کا زمانہ اس کے لیے موت کا پیغام بن کر آتا ہے اور ساری زمین خشک ہو جاتی ہے۔ جہاں سبزہ لہلہا رہا تھا وہاں چٹیل میدان دکھائی دینے لگتا ہے۔ اس طرح ایک زندگی پیدا ہو کر مرجاتی ہے۔ لیکن اگلی بار جب برسات کا موسم آتا ہے اور آسمان سے بارش ہوتی ہے تو وہی مرے ہوئے سبزے دوبارہ جی اٹھتے ہیں اور خشک زمین پھر سبزہ زار نظر آنے لگتی ہے۔ اسی طرح انسان بھی مرنے کے بعد زندہ کیے جائیں گے۔

ایک اور پہلو سے دیکھئے۔ زندگی بعد موت کے بارے میں شبہہ اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ ہم اپنا تصوّر موجودہ جسمانی وجود کی شکل میں کرتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ خارج میں جو ایک چلتا پھرتا جسم دکھائی دیتا ہے، یہی اصل انسان ہے اور جب یہ سڑ گل جائے گا اور اس کے

اجزاء مٹی میں مل چکے ہوں گے تو اس کو دوبارہ کس طرح مجسم کرکے کھڑا کیا جاسکتا ہے۔ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ ایک زندہ انسان کی موت آتی ہے، وہ خاموش ہوجاتا ہے، اس کی حرکت رُک جاتی ہے۔ اس کی تمام صلاحیتیں ختم ہوجاتی ہیں۔ اس کے بعد وہ زمین کے نیچے دبا دیا جاتا ہے یا بعض قوموں کے رواج کے مطابق جلاکر دریا میں بہا دیا جاتا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد وہ ریزے ریزے ہوکر اس طرح زمین کا جزء بن جاتا ہے کہ پھر اس کا کوئی وجود ہمیں نظر نہیں آتا ایک زندہ انسان کو اس طرح ختم ہوتے ہوئے ہم روزانہ دیکھتے ہیں۔ پھر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ انسان جو ختم ہوچکا ہے وہ دوبارہ کیسے موجود ہو جائے گا۔

مگر ہمارا اصل وجود ہمارا یہ جسم نہیں ہے جس کو ہم بظاہر چلتا پھرتا ہوا دیکھتے ہیں۔ بلکہ اصل وجود وہ اندرونی انسان ہے جو آنکھوں سے نظر نہیں آتا۔ جو سوچتا ہے، جو جسم کو متحرک رکھتا ہے، جس کی موجودگی جسم کو زندہ رکھتی ہے اور جس کے نکل جانے کے بعد جسم تو باقی رہتا ہے مگر اس میں کسی قسم کی زندگی نہیں پائی جاتی۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کسی مخصوص جسم کا نام نہیں ہے بلکہ اس روح کا نام ہے جو جسم کے اندر موجود ہوتی ہے۔ جسم کے متعلق ہم کو معلوم ہے کہ یہ بہت سے انتہائی چھوٹے چھوٹے ریزوں سے مل کر بنا ہے۔ جس کو زندہ خلیہ (Living cell) کہتے ہیں۔ ہمارے جسم میں خلیوں کی وہی حیثیت ہے جو کسی مکان میں اس کی اینٹوں کی ہوتی ہے۔ ہمارے جسمانی مکان کی یہ اینٹیں یا اصطلاحی زبان میں خلیے ہماری حرکت اور ہمارے عمل کے دوران میں برابر ٹوٹتے رہتے ہیں جس کی کمی ہم غذا کے ذریعے پوری کرتے ہیں۔ غذا ہضم ہوکر یہی مختلف قسم کے خلیے بناتی ہے جو جسم کی ٹوٹ پھوٹ کو مکمل کر دیتے ہیں۔ اس طرح انسان کا جسم مسلسل گھستا اور بدلتا رہتا ہے۔ پچھلے خلیے ٹوٹتے ہیں اور نئے خلیے ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔ یہ عمل ہر روز

ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ کچھ عرصے کے بعد سارے کا سارا جسم بالکل نیا ہو جاتا ہے۔

یہ عمل اوسطاً دس سال میں مکمل ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں آپ کا جو جسم دس سال پہلے تھا اس میں آج کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ آج آپ کا جسم ایک نیا جسم ہے۔ دس سال کے عرصے میں آپ کے جسم کے جو حصے ٹوٹ کر الگ ہوئے ہیں، اگر ان کو پوری طرح یکجا کیا جا سکے تو بعینہ آپ کی شکل کا ایک دوسرا انسان کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر آپ کی عمر سو سال ہو تو آپ ہی جیسے تقریباً دس انسان بنائے جا سکتے ہیں۔ یہ انسان بظاہر دیکھنے میں آپ کی طرح ہوں گے مگر وہ سب کے سب مردہ جسم ہوں گے۔ جن کے اندر "آپ" موجود نہیں ہوں گے۔ کیوں کہ آپ نے پچھلے جسموں کو چھوڑ کر ایک نئے جسم کو اپنا قالب بنا لیا ہے۔

اس طرح آپ کا جسم بنتا بگڑتا رہتا ہے مگر آپ کے اندر کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ جس چیز کو آپ "میں" کہتے ہیں وہ بدستور باقی ہے۔ آپ نے اگر کسی سے دس سال پہلے ایک معاہدہ کیا تھا تو آپ ہر وقت تسلیم کرتے ہیں کہ یہ معاہدہ "میں" نے کیا تھا۔ حالاں کہ اب آپ کا پچھلا جسمانی وجود باقی نہیں ہے۔ وہ ہاتھ اب آپ کے جسم پر نہیں ہے جس نے معاہدے کے کاغذات پر دستخط کیے تھے اور نہ وہ زبان موجود ہے جس نے معاہدے کی بابت گفتگو کی تھی۔ لیکن "آپ" اب بھی موجود ہیں اور تسلیم کرتے ہیں کہ دس سال پہلے جو معاہدہ میں نے کیا تھا وہ میرا ہی معاہدہ تھا اور اب بھی میں اس کا پابند ہوں یہی وہ اندرونی انسان ہے جو جسم کے ساتھ بدلتا نہیں بلکہ جسم کی کتنی ہی تبدیلیوں کے باوجود اپنے آپ کو باقی رکھتا ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ انسان کسی خاص جسم کا نام نہیں ہے جس کے مرنے سے انسان بھی مر جائے۔ بلکہ وہ ایک ایسی روح ہے جو جسم سے الگ اپنا وجود رکھتی ہے اور جسم کے اجزا منتشر ہونے کے بعد بھی بدستور باقی رہتی ہے۔ جسم کے بدلنے اور روح کے نہ بدلنے میں

اس حقیقت کا صاف اشارہ موجود ہے کہ جسم فانی ہے مگر روح فانی نہیں ۔

بعض نادان لوگ یہ کہتے ہیں کہ زندگی اور موت نام ہے کچھ مادّی اجزاء کے اکٹھے ہونے اور پھر منتشر ہو جانے کا ۔ ان اجزاء کے ملنے سے زندگی بنتی ہے اور ان کے الگ ہو جانے سے موت واقع ہوتی ہے ۔ اسی نظریہ کو چکبست نے ان لفظوں میں ادا کیا ہے :

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب

موت کیا ہے انہیں اجزاء کا پریشاں ہونا

مگر یہ ایک ایسی بات ہے جس کا علم سے کوئی تعلق نہیں ۔ اگر زندگی محض "عناصر میں ظہورِ ترتیب" کا نام ہے تو اس کو اس وقت تک باقی رہنا چاہیے جب تک عناصر کی یہ ترتیب موجود ہے اور یہ بھی ممکن ہونا چاہیے کہ کوئی ہوشیار سائنس داں ان عناصر کو یکجا کر کے زندگی پیدا کر سکے ۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ یہ دونوں باتیں ناممکن ہیں ۔

ہم دیکھتے ہیں کہ مرنے والوں میں صرف وہی نہیں ہیں جن کو کوئی ایسا حادثہ پیش آئے جو ان کے جسم کے ٹکڑے کر دے ۔ بلکہ ہر حالت میں اور ہر عمر کے لوگ مرتے ہیں ۔ بعض مرتبہ تو اچھے خاصے تندرست انسان کے دل کی حرکت یکایک اس طرح بند ہو جاتی ہے کہ کوئی ڈاکٹر بتا نہیں پاتا کہ ایسا کیوں ہوا ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مرنے والے کا جسم اپنی سابقہ حالت میں لیٹا ہوا ہے دوسرے لفظوں میں "عناصر کا ترتیبی ظہور" مکمل طور پر موجود ہے ۔ مگر اس کے اندر جو روح تھی وہ نکل چکی ہے ۔ سارے عناصر اسی خاص ترتیب کے ساتھ اب بھی موجود ہوتے ہیں جو اب سے چند منٹ پہلے تھے مگر اس کے اندر زندگی موجود نہیں ہوتی ۔ یہ واقعہ ظاہر کرتا ہے کہ مادّی عناصر کی ترتیب زندگی پیدا نہیں کرتی بلکہ زندگی اس سے الگ ایک چیز ہے جو اپنا مستقل وجود رکھتی ہے ۔

کسی لیبارٹری میں زندہ انسان نہیں بنایا جاسکتا اگرچہ جسم کی شکل ہر وقت بنائی جاسکتی ہے
یہ معلوم ہوچکا ہے کہ زندہ جسم کے اجزا ر بالکل معمولی کیمیاوی ایٹم ہوتے ہیں۔ اس میں کاربن وہی
ہے جو ہم کالک میں دیکھتے ہیں۔ ہائیڈروجن اور آکسیجن وہی ہے جو پانی کی اصل ہے۔ نائٹروجن
وہی ہے جس سے کرۂ ہوا کا بیشتر حصّہ بنا ہے۔ اور اسی طرح دوسری چیزیں۔ مگر کیا ایک زندہ انسان
محض معمولی ایٹموں کا ایک خاص مجموعہ ہے جو کسی غیر معمولی طریقے سے ترتیب دے دیا گیا ہے۔
یا وہ اس کے علاوہ کچھ اور ہے۔

سائنس داں کہتے ہیں کہ اگرچہ ہم یہ جانتے ہیں کہ انسان کا جسم فلاں فلاں مادّی اجزار
سے مل کر بنا ہے۔ مگر انہی اجزار کو یکجا کر کے ہم زندگی پیدا نہیں کرسکتے۔ دوسرے لفظوں میں
ایک زندہ انسان کا جسم محض بے جان ایٹموں کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ وہ ایٹم اور زندگی دونوں
ہے۔ مرنے کے بعد ایٹموں کا مجموعہ تو ہمارے سامنے موجود رہتا ہے مگر زندگی اس سے رخصت
ہو کر دوسری دنیا میں چلی جاتی ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ زندگی مٹنے والی چیز نہیں ہے۔ بلکہ باقی
رہنے والی چیز ہے۔ اب ہم سمجھ سکتے ہیں کہ زندگی بعد موت کا نظریہ کس قدر عقلی اور فطری نظریہ
ہے۔ یہ حقیقت پکار رہی ہے کہ زندگی صرف وہی نہیں ہوسکتی جو موت سے پہلے نظر
آتی ہے بلکہ مرنے کے بعد بھی ہمیں زندہ رہنا چاہیئے۔ ہماری عقل تسلیم کرتی ہے کہ یہ
دنیا اور اس کی عمر فانی ہے مگر انسان ایک ایسا وجود ہے جو اس کے بعد بھی باقی رہتا
ہے۔ جب ہم مرتے ہیں تو درحقیقت ہم مرتے نہیں بلکہ زندہ رہنے کے لیے دوسری
دنیا میں چلے جاتے ہیں۔ موجودہ زندگی ہماری مسلسل عمر کا محض ایک مختصر
وقفہ ہے نہ کہ مکمل عمر کی انتہا۔

دوسری دنیا

اب اس سوال پر غور کیجیے کہ دوسری زندگی کیسی ہوگی۔ خدا کے رسول کہتے ہیں کہ وہاں جنّت اور دوزخ ہے۔ ہر شخص جو مرتا ہے وہ ان دو میں سے کسی ایک کے اندر داخل کیا جاتا ہے۔ جو شخص آج کی دنیا میں خدا کا فرماں بردار ہوگا اور نیک عمل کرے گا اس کو جنّت کی آرام گاہ میں جگہ ملے گی اور جو بدکردار اور خدا کا نافرمان ہوگا اس کو جہنّم کی تکلیفوں میں ڈالا جائے گا۔

اس کو سمجھنے کے لیے اس حقیقت پر غور کیجیے کہ انسان جو کام بھی کرتا ہے اس کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ ایک واقعہ ہے جیسے کہ بہت سے واقعات ہوتے ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ وہ کسی خاص ارادے کے تحت کیا گیا ہے۔ پہلی حیثیت کو ہم واقعاتی کہہ سکتے ہیں اور دوسری کو اخلاقی۔ ایک مثال سے اس کی مزید وضاحت ہو جائے گی۔

اگر کسی درخت پر کوئی پتھر اٹکا ہوا ہو، آپ اس کے نیچے سے گزریں اور یکایک پتھر آپ کے اوپر گر پڑے اور آپ کا سر ٹوٹ جائے تو آپ درخت سے لڑائی نہیں کریں گے نہ اس پر خفا ہوں گے بلکہ خاموشی سے اپنا سر پکڑے ہوئے گھر چلے جائیں گے۔ اس کے برعکس اگر کوئی آدمی جان بوجھ کر آپ کے اوپر ایک پتھر کھینچ مارے جس سے آپ کا چہرہ زخمی ہو جائے تو آپ اس پر برس پڑتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس کا سر توڑ ڈالیں جس طرح اس نے آپ کا سر توڑا ہے۔

درخت اور انسان میں یہ فرق کیوں ہے۔ کیوں آپ درخت سے بدلہ نہیں لیتے اور انسان سے بدلہ لینا چاہتے ہیں، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ درخت اس احساس و شعور سے خالی ہے جو انسان کو حاصل ہے۔ درخت کا عمل صرف واقعاتی نوعیت رکھتا ہے۔ جب کہ انسان کا عمل واقعاتی اور اخلاقی دونوں ہے۔

اس سے ظاہر ہوا کہ انسان کے عمل کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس کی وجہ سے کوئی

واقعہ دنیا میں ظاہر ہوا۔ دوسرے یہ کہ وہ عمل جائز تھا یا ناجائز۔ صحیح جذبے سے کیا گیا تھا یا غلط جذبے سے۔ اس کو ہونا چاہیے تھا یا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ جہاں تک عمل کی پہلی حیثیت کا تعلق ہے اس کا پورا انجام اسی دنیا میں ظاہر ہوجاتا ہے۔ مگر اس کی دوسری حیثیت کا انجام اس دنیا میں ظاہر نہیں ہوتا۔ اور کبھی ظاہر ہوتا ہے تو نہایت ناقص شکل میں۔

جس شخص نے آپ کو پتھر مارا اس کے عمل کا یہ انجام تو فوراً ظاہر ہوگیا کہ آپ کا سر ٹوٹ گیا مگر اس کے عمل کا دوسرا پہلو کہ اس نے اپنی قوتوں کا غلط استعمال کیا اس کا انجام ظاہر ہونا ضروری نہیں ہے۔ اس نے چاہا تھا کہ سر توڑے اور سر ٹوٹ گیا۔ اس نے چاہا تھا کہ ایک غلط کام کرے مگر اس کے اس دوسرے ارادہ کا کوئی نتیجہ ہمارے سامنے نہیں آیا۔ نتیجہ نام ہے انسانی ارادے کے خارجی ظہور کا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی ارادے کا ایک نتیجہ، واقعاتی نتیجہ، ہمیشہ ظاہر ہوجاتا ہے پھر انسانی ارادے کا دوسرا نتیجہ — اخلاقی نتیجہ۔ بھی ضرور ظاہر ہونا چاہیے۔

آخرت انسانی عمل کے اسی دوسرے پہلو کا مکمل انجام ظاہر ہونے کی جگہ ہے۔ جس طرح آدمی کے عمل کا ایک پہلو کچھ واقعات کو ظہور میں لاتا ہے۔ اسی طرح اس کے عمل کا دوسرا پہلو کچھ دوسرے واقعات کو پیدا کرتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلی قسم کے واقعات کو ہم اسی دنیا میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں اور دوسری قسم کے واقعات کو ہم مرنے کے بعد اگلی دنیا میں دیکھیں گے۔

ہر آدمی جو دنیا میں زندگی گزار رہا ہے وہ اپنے عمل سے اپنے لیے کوئی نہ کوئی نتیجہ پیدا کرنے میں مصروف ہے۔ وہ خواہ بیکار بیٹھا ہو یا کسی کام میں مشغول ہو، اس کی ہر حالت اس کے موافق یا مخالف ایک ردّعمل پیدا کرتی ہے۔ اس کے عادات و اخلاق سے لوگ اس کے بارے میں رائے قائم کرتے ہیں۔ وہ اپنی قوتوں کو جس طرح استعمال کرتا ہے اسی کے لحاظ سے اس

کے کام بنتے یا بگڑتے ہیں، وہ اپنی کوششوں کو جس سمت میں لگاتا ہے اس سمت کی چیزوں پر اس کا حق قائم ہوتا ہے۔

عرض ہر شخص اپنے گردوپیش اپنی ایک دنیا کی تخلیق کر رہا ہے جو عین اس کے عمل کے مطابق ہے۔ یہ آدمی کے عمل کا ایک پہلو ہے جو موجودہ دنیا سے متعلق ہے۔ اسی طرح اس کے کام کی دوسری حیثیت — صحیح یا غلط ہونے کی حیثیت — بھی اپنا ایک انجام پیدا کرتی ہے جو دوسری دنیا میں ذخیرہ ہو رہا ہے۔ ہمارے عمل کا اخلاقی پہلو مستقل طور پر اپنے انجام کی تخلیق کر رہا ہے اور اسی کا نام مذہب کی اصطلاح میں جنّت اور دوزخ ہے۔ ہم میں سے ہر شخص ہر آن اپنے لیے جنّت یا دوزخ کی تعمیر کر رہا ہے۔ چونکہ اس دنیا میں آدمی کو امتحان کی غرض سے ٹھہرایا گیا ہے، اس لیے یہ جنّت دوزخ اس کی نگاہوں سے اوجھل رکھی گئی ہے۔ جب امتحان کی مدّت ختم ہوگی اور قیامت آئے گی تو ہر شخص اپنی تعمیر کی ہوئی دنیا میں پہونچا دیا جائے گا۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ اگر ہمارے عمل کا کوئی اخلاقی انجام ہے تو وہ ہم کو نظر کیوں نہیں آتا۔ مثلاً مکان بنانا ایک عمل ہے جس کا ایک انجام یہ ہے کہ مکان بن کر کھڑا ہو جائے۔ یہ انجام ظاہر ہوتا ہے اور اس کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں مگر اس عمل کا یہ پہلو کہ وہ جائز طریقے پر بنایا گیا ہے یا ناجائز طریقے پر، یہ بھی اگر کوئی انجام پیدا کرتا ہے تو وہ کہاں ہے۔ کیا ایسا بھی کوئی انجام ہو سکتا ہے جس کو دیکھا اور چھوا نہ جا سکتا ہو۔

اس کا جواب خود عمل کی ان دونوں حیثیتوں میں موجود ہے۔ کسی عمل کی جو واقعاتی حیثیت ہے اس کو ہر شخص دیکھتا ہے حتیٰ کہ کیمرے کی بے جان آنکھ بھی اس کو صاف طور پر دیکھ لیتی ہے۔ مگر کسی عمل کی اخلاقی حیثیت نظر آنے والی چیز نہیں ہے۔ وہ صرف محسوس ہوتی ہے دیکھی نہیں

جاتی۔ عمل کی دونوں حیثیتوں کا یہ فرق خود اشارہ کر رہا ہے کہ دونوں قسم کا انجام کس طرح ظاہر ہونا چاہیے۔ یہ اس بات کا صریح اشارہ ہے کہ عمل کی پہلی حیثیت کا انجام اسی دنیا میں نظر آنا چاہیے جس کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور عمل کی دوسری حیثیت کا انجام اُس دنیا میں نظر آئے گا جو ابھی ہماری آنکھوں سے اوجھل ہے۔ گویا جو کچھ ہے، یہی دراصل ہونا بھی چاہیے تھا۔

مگر یہ صرف عقلی امکان ہی کی بات نہیں ہے۔ کائنات کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ بالفعل یہاں دونوں قسم کے انجام پائے جاتے ہیں۔ ایسے بھی جنھیں ہم واقع ہونے کے بعد فوراً دیکھ لیں۔ اور ایسے بھی جو اگرچہ ہماری آنکھوں کو نظر نہیں آتے مگر وہ ایک حقیقت کے طور پر موجود ہوتے ہیں۔ کائنات میں ایسے غیر مرئی نتائج کا موجود ہونا صریح طور پر ظاہر کرتا ہے کہ اسی قسم کے دوسرے غیر مرئی نتائج بھی موجود ہو سکتے ہیں۔ کائنات کی تخلیق اپنے اندر ایسے نتائج کے ہونے کا اقرار کرتی ہے۔

مثال کے طور پر آواز کو لیجئے۔ آپ جانتے ہیں کہ آواز نام ہے ایسی لہروں کا جن کو آنکھ کے ذریعہ دیکھا نہیں جا سکتا۔ جب ہم بولنے کے لیے زبان کو حرکت دیتے ہیں تو اس کی حرکت سے ہوا میں کچھ لہریں پیدا ہوتی ہیں۔ انہیں لہروں کو ہم آواز کہتے ہیں۔ آواز ایک طرح کا غیر مرئی نقش ہے جو ہماری زبان کے ہلنے سے ہوا میں پیدا ہوتا ہے۔ جب بھی کوئی شخص بولتا ہے تو اس کی آواز لہروں کی شکل میں نقش ہو جاتی ہے اور مستقل طور پر باقی رہتی ہے۔ حتیٰ کہ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ اب سے ہزاروں برس پہلے کسی انسان نے جو آواز اپنے منھ سے نکالی تھی۔ جو گفتگو یا تقریر کی تھی سب کی سب ہوا کے اندر لہروں کی شکل میں موجود ہے۔ اگرچہ آج ہم ان آوازوں کو نہیں دیکھتے اور نہ اسے سنتے ہیں۔ لیکن اگر ہمارے پاس ان کو گرفت کرنے والے آلات ہوں تو کسی بھی وقت ان کو بعینہٖ اپنی

سابق شکل میں دُھرایا جا سکتا ہے۔

اس مثال کے ذریعہ ہم دوسری دنیا کے مسئلے کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ جس طرح ہمارے چاروں طرف ہوا کا ایک غلاف ہے۔ اور ہماری ہر آواز منھ سے نکلتے ہی اس پر نقش ہوجاتی ہے۔ حالاں کہ ہم نہ ہوا کو دیکھتے ہیں اور نہ اپنی آواز کے نقوش کو۔ ٹھیک اسی طرح وہ دوسری دنیا بھی ہم کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے اور ہماری نیتوں اور ارادوں کو مسلسل ریکارڈ کرتی جا رہی ہے۔ اس کے پردے پر ہمارے اعمال کے نقوش ثبت ہو رہے ہیں جو مرنے کے بعد ظاہر ہو جائیں گے۔

گراموفون میں چابی بھری ہوئی ہو اور ریکارڈ اس کے اوپر گھوم رہا ہو تو سوئی رکھتے ہی ریکارڈ کی خاموش تختی یکایک اس طرح بول پڑتی ہے جیسے وہ اسی کی منتظر تھی کہ کوئی اس کے اوپر سوئی رکھے اور وہ اپنے اندر کی آواز کو نکالنا شروع کر دے۔ اسی طرح ہمارے تمام اعمال کا ریکارڈ تیار ہو رہا ہے اور جب کائنات کا مالک حکم دے گا تو سارا ریکارڈ اس طرح ہمارے سامنے آجائے گا کہ اس کو دیکھ کر آدمی بے اختیار کہے گا:

مَالِهٰذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصَاهَا

یہ کیسی کتاب ہے۔ میرا چھوٹا بڑا کوئی عمل ایسا نہیں ہے جو اس نے محفوظ نہ کر لیا ہو

اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ ہر ایک منٹ کے اندر دنیا کے ایک سو آدمی مر جاتے ہیں۔ یعنی رات اور دن کے اندر پندرہ لاکھ۔ یہ واقعہ ہر آدمی کو ہلا دینے کے لیے کافی ہے۔ کیوں کہ ہر آدمی کے لیے یہ اندیشہ ہے کہ اگلے ۲۴ گھنٹے کے لیے جن پندرہ لاکھ آدمیوں کی فہرست بن رہی ہے اس میں اس کا نام بھی شامل ہو۔ عقل مند وہ ہے جو اپنے کل کو جان لے۔ جو شخص صرف اپنے آج کو جانے اس سے زیادہ نادان اس

دنیا میں اور کوئی نہیں۔

آخری بات

اوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے ، اب آخر میں پھر ایک بار اس کو اپنے ذہن میں دُہرا لیجئے ۔ آپ کی زندگی ایک نہایت طویل اور مسلسل زندگی ہے ۔ موت اس زندگی کی آخری حد نہیں ہے بلکہ وہ اس کے دوسرے دَور کی ابتدا ہے ۔ موت ہماری زندگی کے دو مرحلوں کے درمیان حدِ فاصل قائم کرتی ہے ۔ اس کو مثال کے طور پر یوں سمجھیے کہ کسان ایک فصل بوتا ہے ، اس پر کوشش کرتا ہے ، اپنا سرمایہ اس میں لگاتا ہے ۔ یہاں تک کہ فصل تیار ہو کر سوکھ جاتی ہے ۔ اس وقت وہ اسے کاٹ لیتا ہے تاکہ اس سے غلّہ حاصل کرکے اپنی سال بھر کی خوراک کا انتظام کرے ۔ فصل کا کٹنا فصل کے ایک دور کا ختم ہونا اور اس کے دوسرے دور کا آغاز ہونا ہے ۔ اس سے پہلے بونا اور فصل کو تیار کرنا تھا ۔ اس کے بعد اس کا پھل حاصل کرنا اور اس سے اپنی ضرورت پوری کرنا ہے ۔ فصل کٹنے سے پہلے صرف کوشش اور خرچ تھا اور فصل کٹنے کے بعد صرف اپنی محنت کا نتیجہ پانا اور اس سے فائدہ اٹھانا ہے ۔

ٹھیک یہی حال ہماری زندگی کا بھی ہے ۔ ہم اس دنیا میں اپنی آخرت کی فصل تیار کر رہے ہیں ۔ ہم میں سے ہر شخص آخرت میں اپنا ایک کھیت رکھتا ہے جس میں وہ یا تو کاشت کر رہا ہے یا اس کو خالی چھوڑے ہوئے ہے ۔ اس نے یا تو خراب بیج استعمال کئے ہیں یا اچھے بیج ڈالے ہیں ۔ اس نے بیج ڈال کر یا تو اسے چھوڑ دیا ہے یا وہ بیج ڈالنے کے بعد مسلسل اس کی نگرانی کر رہا ہے ۔ اس نے یا تو کانٹوں کی فصل بوئی ہے یا پھل اور پھول اگائے ہیں ۔ وہ یا تو اپنی ساری قوت اس کھیتی کو بہتر بنانے میں لگائے ہوئے ہے یا دوسرے غیر متعلق مشاغل اور

دل چسپیوں میں بھی وہ اپنا وقت ضائع کر رہا ہے ۔ اس فصل کی تیاری کی مدت اس وقت تک ہے جب تک ہم کو موت نہیں آجاتی ۔ موت آخرت کی فصل کاٹنے کا دن ہے ۔ جب اس دنیا میں ہماری آنکھ بند ہوگی تو دوسری دنیا میں ہماری آنکھ کھلے گی ۔ وہاں ہماری عمر بھر کی تیار کی ہوئی کھیتی ہمارے سامنے ہوگی ۔

یاد رکھیے کاٹنے کے دن وہی کاٹتا ہے جس نے کاٹنے سے پہلے کھیتی کی ہو اور وہی چیز کاٹتا ہے جو اس نے اپنے کھیت میں بوئی تھی ۔ اسی طرح آخرت میں ہر شخص کو وہی فصل ملے گی جو اس نے موت سے پہلے تیار کی ہے ۔ ہر کسان جانتا ہے کہ اس کے گھر میں ٹھیک اتنا ہی غلّہ آئے گا جتنی اس نے محنت کی ہے اور وہی چیز آئے گی جو اس نے بوئی تھی ۔ اسی طرح آخرت میں بھی آدمی کو اسی کے بقدر ملے گا جتنی اس نے جدوجہد کی ہے اور وہی کچھ ملے گا جس کے لیے اس نے کوشش کی ہو ۔ موت کوشش کی مدّت ختم ہونے کا آخری اعلان ہے اور آخرت اپنی کوششوں کا انجام پانے کی آخری جگہ ۔ موت کے بعد نہ دوبارہ کوشش کرنے کا موقع ہے اور نہ آخرت کبھی ختم ہونے والی ہے ۔ کتنا سنگین ہے یہ واقعہ ۔ کاش انسان موت سے پہلے اس حقیقت کو سمجھ لے کیوں کہ موت کے بعد سمجھنا کچھ بھی کام نہ آئے گا ۔ موت کے بعد ہوشیار ہونے کے معنی صرف یہ ہیں کہ آدمی اس بات پر افسوس کرے کہ اس نے ماضی میں کتنی بڑی غلطی کی ہے ۔ ایک ایسی غلطی جس کی اب کوئی تلافی نہیں ہوسکتی ۔

انسان اپنے انجام سے غافل ہے حالاں کہ زمانہ اس کو نہایت تیزی سے اس وقت کی طرف لیے جا رہا ہے جب فصل کٹنے کا وقت آجائے گا ۔ وہ دنیا کے حقیر فائدوں کو حاصل کرنے میں مصروف ہے اور سمجھتا ہے کہ میں کام کر رہا ہوں ۔ حالاں کہ دراصل وہ اپنے قیمتی اوقات کو ضائع کر رہا ہے ۔

انسان کے سامنے ایک عظیم موقع ہے جس کو استعمال کرکے وہ اپنے لیے ایک ناقابل قیاس حد تک شاندار مستقبل بنا سکتا ہے۔ مگر وہ کنکریوں سے کھیل رہا ہے۔ اس کا رب اس کو اپنی جنّت کی طرف بلا رہا ہے جو لامتناہی عزّت اور آرام کی جگہ ہے۔ مگر وہ چند دن کی جھوٹی لذّتوں میں کھویا ہوا ہے وہ سمجھتا ہے کہ میں حاصل کر رہا ہوں حالاں کہ وہ صرف ضائع کر رہا ہے۔ دنیا میں مکان بنا کر وہ سمجھتا ہے کہ میں اپنی زندگی کی تعمیر کر رہا ہوں حالاں کہ وہ صرف ریت کی دیواریں اٹھا رہا ہے جو اسی لیے بنتی ہیں کہ بننے کے بعد منہدم ہو جائیں۔

انسان اپنے آپ کو پہچان۔ تو کیا کر رہا ہے اور تجھے کیا کرنا چاہیے! (۱۹۶۰)

عقیدۂ خدا

عقیدۂ خدا

کائنات کا ایک خدا ہے جو اس کا خالق اور مالک ہے۔ اس خدا کے وجود کی سب سے بڑی دلیل خود وہ کائنات ہے جو ہمارے سامنے پھیلی ہوئی ہے۔ کائنات اپنے پورے وجود کے ساتھ پکار رہی ہے کہ ایک عظیم خدا ہے جس نے اس کو بنایا اور جو اس کو اپنی بے پناہ طاقت سے چلا رہا ہے۔ ہم مجبور ہیں کہ ہم کائنات کو مانیں اور اس لئے ہم مجبور ہیں کہ ہم خدا کو مانیں۔ کیوں کہ کائنات کو ماننا اس وقت تک بے معنٰی ہے جب تک اس کے خالق و مالک کو نہ مانا جائے۔ کائنات اتنی حیرت انگیز ہے کہ وہ کسی بنانے والے کے بغیر نہیں بن سکتی اور اس کا نظام اتنا عجیب ہے کہ وہ کسی چلانے والے کے بغیر نہیں چل سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کو ماننے پر آدمی اسی طرح مجبور ہے جس طرح وہ کائنات کو ماننے پر مجبور ہے۔

آپ سائیکل کے پہیہ پر ایک کنکری رکھیں اور اس کے بعد پیڈل چلا کر پہیہ کو تیزی سے گھمائیں تو کنکری دور جا کر گرے گی۔ حالانکہ سائیکل کے پہیہ کی رفتار مشکل سے ۲۵ میل فی گھنٹہ ہے۔ ہماری یہ زمین جس پر ہم رہتے ہیں وہ بھی ایک بہت بڑے پہیہ کی مانند گھوم رہی ہے مگر ہمارے ساتھ کنکری والا واقعہ پیش نہیں آتا۔

زمین اپنے محور پر مسلسل ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑ رہی ہے۔ یہ رفتار سواری کے عام ہوائی جہازوں سے زیادہ ہے۔ ہم اس تیز رفتار زمین پر چلتے پھرتے

ہیں۔ گھر اور شہر بناتے ہیں۔ مگر ہمارا وہ حال نہیں ہوتا جو گھومتے ہوئے پہیہ پر رکھی ہوئی کنکری کا ہوتا ہے۔ کیسا عجیب ہے یہ معجزہ۔ کہا جاتا ہے کہ زمین پر ہمارے قائم رہنے کی وجہ یہ ہے کہ نیچے سے زمین بہت بڑی طاقت کے ساتھ کھینچ رہی ہے اور اوپر سے ہوا کا بھاری دباؤ ہم کو زمین کی سطح پر روکے رہتا ہے۔ یہ دو طرفہ عمل ہم کو زمین پر تھامے ہوئے ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم پہیہ کی کنکری کی طرح فضا میں اڑ نہیں جاتے۔ مگر بات صرف اتنی ہی نہیں۔ یہ جواب درحقیقت یہ بتاتا ہے کہ ہمارے آس پاس ایک اور اس سے بھی زیادہ بڑا معجزہ موجود ہے۔ زمین میں اتنے بڑے پیمانہ پر کھینچنے کی قوت ہونا اور اس کے چاروں طرف ہوا کا پانچ سو میل موٹا غلاف مسلسل لپٹا رہنا صرف معاملہ کی حیرت ناکی کو بڑھاتا ہے، وہ کسی بھی درجہ میں اس کو کم نہیں کرتا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا کی ہر چیز معجزہ ہے۔ آدمی مٹی کے اندر ایک چھوٹا سا دانہ ڈالتا ہے۔ اس کے بعد حیرت انگیز طور پر وہ دیکھتا ہے کہ مٹی کے اندر سے ایک ہری اور سفید مولی نکلی چلی آرہی ہے۔ وہ دوسرا دانہ ڈالتا ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ اس کے اندر سے میٹھا گاجر نکلا چلا آرہا ہے۔ اسی طرح بے شمار دوسری چیزیں۔ کسی دانہ کو مٹی میں ڈالنے سے امرود نکل رہا ہے۔ کسی دانہ کو ڈالنے سے آم۔ کسی دانہ سے شیشم کا درخت نکلا چلا آرہا ہے اور کسی دانہ سے چنار کا۔ پھر ان میں سے ہر ایک کی صورت الگ، ہر ایک کا مزہ الگ، ہر ایک کے فائدے الگ، ہر ایک کی خاصیتیں الگ۔ ایک ہی مٹی ہے اور ناقابل لحاظ چھوٹے چھوٹے بیج ہیں اور ان سے اتنی مختلف چیزیں اتنی مختلف صفتوں کو لئے ہوئے نکل رہی ہے جن کی گنتی نہیں کی جاسکتی۔

حیرت ناک معجزوں کی ایک پوری کائنات ہمارے چاروں طرف پھیلی ہوئی دکھائی

دیتی ہے۔ایک ایسی دنیا جہاں سارے انسان مل کر ایک ذرہ کی بھی تخلیق نہیں کرسکتے وہاں ہر لمحہ بے شمار طرح طرح کی چیزیں پیدا ہوتی چلی جا رہی ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ یہ سب اتنے بڑے معجزے ہیں کہ ان کے کمالات کو انسانی زبان میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ان کو بتانے کے لئے ہماری لغت کے تمام الفاظ بھی ناکافی ہیں۔ہمارے الفاظ ان معجزوں کے اتھاہ کمالات کو صرف محدود کرتے ہیں۔وہ کسی درجہ میں بھی ان کا اظہار نہیں کرتے۔کیا یہ معجزہ ایک خدا کے بغیر خود بخود وجود میں آسکتا ہے۔

دنیا کی ہر چیز ایٹم سے بنی ہے۔ ہر چیز اپنے آخری تجزیہ میں ایٹوں کا مجموعہ ہے۔ مگر کیسا عجیب معجزہ ہے کہ کہیں ایٹوں کی ایک مقدار جمع ہوتی ہے تو سورج جیسا روشن کرہ بن جاتا ہے۔دوسری جگہ یہی ایٹم جمع ہوتے ہیں تو وہ بہتے ہوئے پانی کی صورت میں رواں ہو جاتے ہیں۔تیسری جگہ ایٹموں کا یہی مجموعہ لطیف ہواؤں کی صورت اختیار کرلیتا ہے کسی اور جگہ یہی ایٹم زرخیز زمین کی صورت میں ڈھل جاتے ہیں۔اسی طرح دنیا میں ان گنت چیزیں ہیں۔سب کی ترکیب ایٹم سے ہوئی ہے۔مگر سب کی نوعیت اور خاصیت جدا جدا ہے۔

اس قسم کی ایک معجزاتی کائنات اپنی بے شمار سرگرمیوں کے ساتھ انسان کی خدمت میں لگی ہوئی ہے۔انسان کو اپنی زندگی کے لئے جو کچھ درکار ہے وہ بہت بڑے پیمانہ پر دنیا میں جمع کر دیا گیا ہے اور ہر روز جمع کیا جا رہا ہے۔دنیا کو اپنے لئے قابل استعمال بنانے کی خاطر انسان کو خود جو کچھ کرنا ہے وہ بہت تھوڑا ہے۔کائناتی انتظام کے تحت بے حساب مقدار میں قیمتی رزق پیدا کیا جاتا ہے۔ہم اس میں صرف اتنا کرتے ہیں کہ اپنا ہاتھ اور منھ چلا کر اس کو اپنے پیٹ میں ڈال لیتے ہیں۔اس کے بعد ہمارے ارادہ کے بغیر خودکار فطری

نظام کے تحت غذا ہمارے اندر تحلیل ہوتی ہے اور گوشت اور خون اور ہڈی اور ناخن اور بال اور دوسری بہت سی چیزوں کی صورت اختیار کرکے ہمارے جسم کا جزء بن جاتی ہے۔ زمین و آسمان کی بے شمار گردشوں کے بعد وہ حیرت انگیز چیز پیدا ہوتی ہے جس کو تیل کہتے ہیں۔ انسان صرف یہ کرتا ہے کہ اس کو نکال کر اپنی مشینوں میں بھر لیتا ہے۔ اور پھر یہ سیال ایندھن انسانی تہذیب کے پورے نظام کو حیرت انگیز طور پر رواں دواں کر دیتا ہے۔ اسی طرح کائنات کے نظام کے تحت وہ ساری چیزیں بے شمار تعداد اور مقدار میں پیدا کی گئی ہیں جن پر انسان صرف معمولی عمل کرتا ہے اور اس کے بعد وہ کپڑا، مکان، فرنیچر، آلات، مشینوں، سواریوں اور بے شمار تمدنی ساز وسامان کی صورت میں ڈھل جاتی ہیں۔ کیا یہ واقعات اس بات کے ثبوت کے لئے کافی نہیں کہ اس کا ایک بنانے والا اور چلانے والا ہے۔

اب ایک اور پہلو سے دیکھئے۔ قدرت اپنے طویل اور ناقابل بیان عمل کے ذریعہ ہر قسم کی چیزیں تیار کر کے ہم کو دے رہی ہے۔ انسان ان کو اپنے حق میں کارآمد بنانے کے لئے بے حد تھوڑا حصہ ادا کرتا ہے۔ وہ لوہے کو مشین کی صورت میں ڈھالتا ہے۔ اور تیل کو صاف کر کے اس کو اپنی گاڑی کی ٹنکی میں بھرتا ہے۔ مگر اس قسم کے معمولی عمل کا نتیجہ یہ ہے کہ خشکی اور تری فساد سے بھر گئے ہیں۔ قدرت نے ہم کو ایک انتہائی حسین اور خالص دنیا دی تھی۔ مگر ہمارے عمل نے ہم کو دھواں، شور، غلاظت، توڑ پھوڑ، لڑائی جھگڑا اور طرح طرح کے ناقابل حل مسائل سے گھیر لیا ہے۔ ہم اپنے کارخانوں یا تمدنی سرگرمیوں کی صورت میں جو تھوڑا سا عمل کرتے ہیں وہی عمل کائنات میں بے حساب گنا زیادہ بڑے پیمانے پر رات دن ہو رہا ہے۔ مگر یہاں

کسی قسم کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔

زمین مسلسل دو قسم کی دوڑ میں لگی ہوئی ہے۔ ایک اپنے محور پر اور دوسری سورج کے گرد اپنے مدار پر، مگر وہ کوئی شور برپا نہیں کرتی۔ درخت ایک عظیم الشان کارخانہ کی صورت میں کام کرتے ہیں مگر وہ دھواں نہیں بکھیرتے۔ سمندروں میں بے شمار جانور ہر روز مرتے ہیں مگر وہ پانی کو خراب نہیں کرتے۔ کائنات کا نظام کھرب ہا کھرب سال سے چل رہا ہے مگر اس کا منصوبہ اتنا کامل ہے کہ اس کو کبھی اپنے منصوبہ پر نظر ثانی کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ بے شمار ستارے اور سیارے خلا میں ہر وقت دوڑ رہے ہیں۔ مگر ان کی رفتار میں کبھی فرق نہیں آتا، وہ کبھی آگے پیچھے نہیں ہوتے۔ یہ تمام معجزوں سے بڑا معجزہ اور تمام کرشموں سے بڑا کرشمہ ہے جو ہر لحہ ہماری دنیا میں پیش کیا جارہا ہے۔ کیا اس کے بعد کوئی اور ثبوت چاہئے کہ آدمی اس کائنات کے پیچھے ایک عظیم خدائی طاقت کو تسلیم کرے۔

پھر زندگی کو دیکھئے۔ فطرت کا کیسا انوکھا واقعہ ہے کہ چند مادی چیزیں خود بخود ایک جسم میں یکجا ہوتی ہیں اور پھر ایک ایسی شخصیت وجود میں آجاتی ہے جو مچھلی بن کر پانی میں تیرتی ہے۔ جو چڑیا بن کر ہوا میں اڑتی ہے۔ طرح طرح کے جانوروں کی صورت میں زمین پر چلتی پھرتی ہے، انھیں میں وہ جاندار بھی ہے جس کو انسان کہا جاتا ہے۔ پر اسرار اسباب کے تحت ایک موزوں جسم بنتا ہے۔ اور اس کے اندر ہڈیاں ایک انتہائی بامعنی ڈھانچہ کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ پھر اس کے اوپر گوشت چڑھایا جاتا ہے۔ اس کے اوپر کھال کی تہیں اوڑھائی جاتی ہیں، بال اور ناخن پیدا کئے جاتے ہیں۔ پھر سارے جسم میں خون کی نہریں جاری کی جاتی ہیں۔ اس طرح ایک خودکار عمل کے

ذریعہ ایک عجیب وغریب انسان بنتا ہے، جو چلتا ہے، جو پکڑتا ہے، جو دیکھتا ہے، جو سنتا ہے، جو سونگھتا ہے، جو چکھتا ہے، جو سوچتا ہے، جو یاد رکھتا ہے، جو معلومات جمع کرکے ان کو مرتب کرتا ہے، جو لکھتا اور بولتا ہے۔

مردہ مادّہ سے اس قسم کے ایک حیرت ناک وجود کا بن جانا ایک ایسا انوکھا واقعہ ہے کہ معجزہ کا لفظ بھی اس کے اعجاز کو بتانے کے لئے کافی نہیں۔ اگر کوئی شخص کہے کہ میں نے مٹی کو بولتے ہوئے سنا ہے اور پتھر کو چلتے ہوئے دیکھا ہے تو لوگ حیران ہوکر رہ جائیں گے۔ مگر یہ انسان جو چلتا پھرتا ہے جو بولتا اور دیکھتا ہے آخر مٹی پتھر ہی تو ہے۔ اس کے اجزاء وہی ہیں جو "مٹی اور پتھر" کے ہوتے ہیں۔ مٹی اور پتھر کے بولنے اور دیکھنے کی خبر کو ہم جس طرح عجیب سمجھیں گے اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ تعجب ہم کو اس مخلوق پر ہونا چاہئے جس کو انسان کہا جاتا ہے۔ بے جان مادہ میں اس قسم کی زندگی اور شعور پیدا ہو جانا کیا اس بات کا ثبوت نہیں کہ یہاں ایک برتر ہستی ہے جس نے اپنی خصوصی قدرت سے یہ عجیب وغریب معجزہ رونما کیا ہے۔

انسان اگر خود اپنے اوپر غور کرے تو بہ آسانی وہ خدا کی حقیقت کو سمجھ سکتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کی صورت میں ایک "میں" زمین پر موجود ہے۔ اس کی اپنی ایک مستقل ہستی ہے۔ وہ دوسری چیزوں سے الگ اپنا ایک وجود رکھتا ہے۔ یہ "میں" بلااشتباہ یقین رکھتا ہے کہ وہ ہے۔ وہ سوچتا ہے اور رائے قائم کرتا ہے۔ وہ ارادہ کرتا ہے اور اس کو بالفعل نافذ کرتا ہے۔ وہ اپنے فیصلہ کے تحت کہیں ایک رویہ اور کہیں دوسرا رویہ اختیار کرتا ہے۔ یہی شخصیت اور قوت جس کا ایک آدمی اپنی "میں" کی سطح پر ہر وقت تجربہ کر رہا ہے۔ یہی "میں" اگر خدا کی صورت میں

زیادہ بڑے پیمانہ پر موجود ہو تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کو ماننا ایسا ہی ہے جیسے اپنے آپ کو ماننا۔ اسی لئے قرآن میں کہا گیا ہے کہ آدمی اپنے واسطے آپ دلیل ہے چاہے وہ کتنی ہی معذرت کرے۔ (قیامہ)

لوگ خدا پر اور خدا کے پیغام پر یقین کرنے کے لئے معجزاتی دلیل مانگتے ہیں۔ آخر لوگوں کو اس کے سوا اور کون سا معجزہ درکار ہے جو ناقابل قیاس حد تک بڑے پیمانے پر ساری کائنات میں جاری ہے۔ اگر اتنا بڑا معجزہ آدمی کو جھکانے کے لئے کافی نہ ہو تو دوسرا کوئی معجزہ دیکھ کر وہ کیسے ماننے کے لئے تیار ہو جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کو ماننے اور اس کے آگے اپنے آپ کو ڈالنے کے لئے جس چیز کی ضرورت ہے وہ ہر وقت آدمی کے سامنے موجود ہے۔ اس کے باوجود آدمی اگر خدا کو اور اس کے جلال و کمال کو نہ مانے تو یہ اس کا اپنا قصور ہے نہ کہ کسی اور کا۔

جو شخص خدا کو پالے اس نے سب کچھ پالیا۔ خدا کو پانے کے بعد کوئی چیز پانے کے لئے باقی نہیں رہتی۔ اس لئے جب کوئی شخص خدا کو پاتا ہے تو اس کی ساری توجہ خدا کی طرف لگ جاتی ہے۔ اس کے لئے خدا ایسا اتھاہ خزانہ بن جاتا ہے جہاں وہ سب کچھ موجود ہو جو آدمی کو اپنی دنیا و آخرت کے لئے درکار ہے۔

ایک شخص "سیب" کھائے۔ مگر سیب کے کھانے سے اس کو نہ کوئی مزہ ملے اور نہ وہ اس کے جسم میں داخل ہو کر اس کو طاقت دے تو کہا جائے گا کہ اس نے سیب نہیں کھایا، اس نے سیب کی شکل کی کوئی چیز چبائی ہے۔ ایسا ہی کچھ معاملہ خدا کا بھی ہے۔ خدا کو پانا وہی پانا ہے جو آدمی کے لئے مزہ بن جائے۔ جب "خدا" کو پا کر بھی آدمی مزہ سے خالی رہے تو کہنا چاہئے کہ اس نے خدا کو نہیں پایا۔ اس نے کوئی اور

چیز پائی ہے اور غلطی سے اس کو خدا سمجھ رہا ہے۔ وہ مٹی کا سیب چبا رہا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں حقیقی سیب کھا رہا ہوں۔

دنیا اپنی ابتدائی شکل میں صرف ایک قسم کا مادہ ہے۔ ساری دنیا ایٹموں کا مجموعہ ہے۔ بالفاظ دیگر ساری دنیا بے روح مادہ ہے۔ اس بے روح مادہ کو خدا بے شمار صورتوں میں جلوہ گر کر رہا ہے۔ اس بے روح مادہ سے خدا کہیں روشنی پیدا کر رہا ہے اور کہیں حرارت۔ کہیں وہ اس بے روح مادہ کو ہریالی میں تبدیل کر رہا ہے اور کہیں پانی کی روانی میں۔ کہیں وہ اس بے روح مادہ کو رنگ کی صورت میں ظاہر کر رہا ہے اور کہیں مزہ اور خوشبو کی صورت میں۔ کہیں اس بے روح مادہ سے حرکت کے کرشمے ظاہر ہو رہے ہیں اور کہیں کشش کے کرشمے۔ ایسے عجیب وغریب قدرت والے خدا کو پانا ایک خشک عقیدہ کو پانا نہیں ہو سکتا۔ ایسے خدا کو پانا تو یہ ہے کہ آدمی کی روح ایک اتھاہ روشنی سے جگمگا اٹھے۔ وہ اس کے قلب کے لئے لطف و لذت کا سمندر بن جائے۔

آدمی ایک عمدہ پھل کھاتا ہے تو وہ باغ باغ ہو جاتا ہے۔ ایک شخص ایک لطیف نغمہ سنتا ہے تو وہ ہمہ تن وجد میں آجاتا ہے۔ کسی کے یہاں ایک خوبصورت بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہیں رہتا۔ پھر خدا جو ساری خوبیوں کا سرچشمہ ہے، اس کا پانا کیا کسی کو بے قرار نہیں کرے گا۔ وہ محض ایک بے کیف واقعہ بن کر رہ جائے گا۔

خدا کو پانا یہ ہے کہ وہ ایک خوشبو ہو جس سے آدمی کا شامہ معطر ہو جائے۔ وہ ایک مزہ ہو جس سے اس کا ذائقہ لطف اندوز ہو۔ وہ ایک

لطافت ہو جو اس کے لامسہ کو کیف سے بھر دے۔ وہ ایک حسن ہو جو اس کی بصارت کو ایک حیرت ناک نظارہ میں محو کر دے۔ وہ ایک ترنم ہو جو اس کے سامعہ کو ایسی لذت دے جس سے وہ کبھی سیر نہ ہو۔ جس خدا نے روشنی پیدا کی، کیسے ممکن ہے کہ اس کے اندر روشنی نہ ہو۔ جس خدا نے مزہ پیدا کیا کیسے ممکن ہے کہ اس میں مزہ نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا تمام روشنیوں سے زیادہ روشن ہے۔ وہ تمام مزوں سے زیادہ مزے والا ہے۔ کسی کو خدا کی قربت ملنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص رنگت اور خوشبو کے ابدی چمنستان میں جا بسے، جیسے وہ ایک پیکر نور کے پڑوس میں پہنچ جائے۔

خدا ساری حکمتوں کا خزانہ ہے، اس لئے خدا کو پانا آدمی کو انتہائی باشعور بنا دیتا ہے۔ خدا سارے زمین و آسمان کا نور ہے، اس لئے خدا کو پانا آدمی کی پوری شخصیت کو ربانی نور سے جگمگا دیتا ہے۔ خدا تمام طاقتوں کا سرچشمہ ہے، اس لئے خدا کو پانا آدمی کو اتنا طاقت ور بنا دیتا ہے کہ کوئی سیلاب اس کو غرق نہ کر سکے اور کوئی طوفان اس کے درخت کو اکھاڑنے والا ثابت نہ ہو۔

رسالت

رسالت

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ غیر مسلم آئے اور آپ سے آپ کے پیغمبر ہونے کا ثبوت مانگا۔ انھوں نے کہا کہ خدا کے پیغمبر حضرت موسیٰ عصا اور ید بیضا لے کر آئے جو لوگوں کے لئے ان کی پیغمبری کا ثبوت تھا۔ اسی طرح خدا کے پیغمبر حضرت عیسیٰ اندھوں کو بینا کرتے تھے اور کوڑھیوں کو اچھا کرتے تھے، یہ ان کا معجزہ تھا جو ان کے پیغمبر خدا ہونے کو ثابت کرتا تھا۔ اسی طرح دوسرے پیغمبر بھی کوئی نہ کوئی معجزہ لائے اور اس کو اپنی پیغمبری کے ثبوت کے لئے پیش کیا۔ آپ بتائیں کہ آپ اپنی پیغمبری کے ثبوت کے لئے کیا معجزہ لائے ہیں۔

آپ نے خاموشی کے ساتھ ان کے سوال کو سنا اور اس کے بعد سورہ آل عمران کے آخر کی یہ آیتیں پڑھیں: زمین و آسمان کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری باری آنے میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں جو اٹھتے، بیٹھتے اور لیٹتے ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین کی بناوٹ میں غور کرتے ہیں۔ وہ بے اختیار پکار اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے رب، تونے یہ سب کچھ بے مقصد نہیں بنایا۔ تو پاک ہے اس سے کہ تو عبث کام کرے۔ پس اے ہمارے رب، ہم کو آگ کے عذاب سے بچا۔ اے ہمارے رب، ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو ایمان کی طرف پکار رہا تھا اور کہتا تھا کہ اپنے رب کو مانو۔ ہم نے

اس کی دعوت قبول کی ۔ اے ہمارے رب ، ہمارے گناہوں کو معاف فرما اور ہم سے درگزر فرما۔ ہماری برائیوں کو دور کردے اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ کر (آل عمران)

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ آیتیں پڑھ کر سنانا دوسرے لفظوں میں یہ کہنا تھا کہ میری نبوت کا ثبوت وہ پوری کائنات ہے جو تمہارے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ زمین و آسمان کا پورا نظام اپنی خاموش زبان میں رسالت اور پیغام رسالت کی تصدیق کر رہا ہے۔ پھر اس کے بعد کسی اور معجزہ کی کیا ضرورت۔

پیغمبر اسلام کی نبوت دائمی نبوت تھی۔ اس لئے آپ کے لئے وقتی معجزہ کارآمد نہ تھا۔ آپ کے لئے وہ معجزہ مفید تھا جو آپ کی نبوت کی طرح مستقل ہو اور آپ کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی باقی رہے۔ تاکہ ہر دور کا انسان اس کو دیکھ سکے اسی لئے آپ نے خدا کی دنیا کو اپنے حق میں ابدی معجزہ کی حیثیت سے پیش کیا۔ قرآن میں عالمی نظام کے ان پہلوؤں کی نشان دہی کی گئی جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ انسان کی اصلاح کے لئے خدائی رہنمائی کا انتظام ہونا چاہئے۔

کائنات اپنے پورے وجود کے ساتھ ایک سوال ہے اور پیغمبری اسی سوال کا جواب۔ ہمارے سامنے ایک انتہائی عظیم اور مکمل دنیا ہے۔ وہ نہ صرف موجود ہے بلکہ ایک حد درجہ محکم نظام کے ساتھ مسلسل متحرک ہے۔ اس کے اندر نہ کوئی نقص ہے اور نہ کوئی خلا۔ وہ ناقابل قیاس تنوع اور پھیلاؤ کے باوجود کمال درجہ ہم آہنگ ہے۔ اس کے اندر انتہائی بامعنی سرگرمیاں جاری ہیں۔ وہ اپنے بے شمار اجزار

کے ساتھ انتہائی محکم بنیادوں پر چل رہی ہے۔ ایسی ایک کائنات کو دیکھ کر فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا خالق و مالک کون ہے۔ کون ہے جو اس کو عدم سے وجود میں لے آیا۔

کائنات یہ انتہائی اہم سوال ہمارے سامنے لاتی ہے مگر وہ اس کا کوئی جواب نہیں دیتی۔ وہ ہم کو قوس قزح کا مشاہدہ کراتی ہے مگر وہ ہم کو اپنے خالق کا چہرہ نہیں دکھاتی۔ کائنات میں حرکت ہے، زندگی ہے، روشنی ہے، تخلیق ہے، مختلف قسم کی طاقتیں ہیں۔ حتیٰ کہ طرح طرح کے جانداروں کی صورت میں بولنے والی زبانیں بھی ہیں۔ مگر اس اہم ترین سوال کے بارے میں سب خاموش ہیں۔ کوئی بھی انسان کو اس سوال کا جواب نہیں دیتا۔ کسی پہاڑ کی چوٹی پر ایسا کوئی بورڈ لگا ہوا نہیں ہے جہاں اس سوال کا جواب لکھا ہوا نظر آتا ہو۔ یہ صورت حال پکار رہی ہے کہ کوئی بتانے والا ہو جو انسان کو اس سوال کے بارے میں بتائے۔

اسی کے ساتھ دوسرا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ اس کائنات کا انجام کیا ہے۔ کائنات کی ہر چیز حرکت میں ہے۔ زمین مسلسل سفر کر رہی ہے۔ شمسی نظام زمین اور دوسرے سیاروں کو لئے ہوئے ایک طرف کو چلا جا رہا ہے۔ پھر کہکشاں ہمارے شمسی نظام اور دوسرے ستاروں کو لئے ہوئے ہر لمحہ رواں دواں ہے۔ کائنات کا قافلہ اپنے تمام اجزاء کے ساتھ کسی منزل کی طرف چلا جا رہا ہے۔ مگر کوئی بھی اپنی منزل کے بارے میں اعلان نہیں کرتا۔ کائنات کچھ نہیں بتاتی کہ وہ کہاں سے چلی ہے اور کہاں چلی جا رہی ہے اور بالآخر وہ کہاں پہونچنے والی ہے۔

یہ شدید ترین اہمیت رکھنے والا سوال ہے۔ کیوں کہ کائنات کے تیز رفتار

قافلہ میں انسان بھی شریک ہے اور وہ مسلسل ایک نامعلوم سفر کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ اگر وہ اپنے سفر اور اپنی منزل کی بابت نہ جانے تو سارا سفر اندھیرے کا سفر بن جائے گا۔ اس صورت حال کا تقاضا ہے کہ یہاں کوئی انتظام ہو جو انسان کو اس معاملہ کی حقیقت سے باخبر کرے۔

پھر اسی سے متعلق یہ سوال ہے کہ انسان کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ آدمی کے سامنے بے شمار معاملات آتے ہیں اور ان کے درمیان ایک سے زیادہ طریقے اختیار کرنا اس کے لئے ممکن رہتا ہے، پھر انسان کون سا معیار اپنے سامنے رکھے۔ وہ کونسا طریقہ اختیار کرے اور کون سا طریقہ اختیار نہ کرے۔ انسان کے لئے راہ عمل کیا ہو۔ پانی کا راستہ زمین کے نشیب و فراز سے بن جاتا ہے۔ درخت سے لے کر ستاروں تک ہر چیز کا ایک نظام مقرر ہے جس پر وہ پابندی کے ساتھ چلے جا رہے ہیں۔ کائنات کی دوسری چیزوں کے لئے یہ سوال نہیں کہ وہ کس کو لے اور کس کو چھوڑ دے۔ جب کہ انسان اپنے اختیار کی وجہ سے ہر وقت اس سوال سے دوچار رہتا ہے۔ پوری کائنات میں انسان ہی ایک ایسی مخلوق ہے جس کے سامنے کوئی معلوم اور مقرر راہ عمل نہیں۔

سورج حد درجہ پابند نظام کے تحت ہر روز ہمارے لئے روشنی بھیجتا ہے۔ مگر وہ ہماری اپنی زندگی کے سوال پر کوئی روشنی نہیں ڈالتا۔ ہوا ایک مکمل نظام کے تحت چلتی ہے اور پھولوں کی خوشبو ہمارے مشام تک پہنچاتی ہے مگر وہ ہمارے اصل مسئلہ کے بارے میں ہم کو کوئی خبر نہیں دیتی۔ پانی ایک متعین قانون میں بندھا ہوا ہے، وہ ہمارے لئے ٹھنڈک اور تراوٹ لے کر آتا ہے مگر ہماری تلاش کے

بارے میں وہ ہماری کوئی مدد نہیں کرتا۔ زمین اپنی محوری گردش کے ذریعہ ہر روز ہمارے لئے دن لاتی ہے اور رات کا پردہ ہمارے اوپر سے ہٹاتی ہے مگر وہ زندگی کے بھید کا پردہ نہیں کھولتی۔ درخت زمین کو پھاڑ کر نکلتے ہیں اور ایک منظم کارخانہ کی طرح عمل کرتے ہوئے ہمارے لئے رزق اور سایہ فراہم کرتے ہیں۔ مگر وہ ہماری ذہنی غذا کے لئے ہمیں کوئی چیز فراہم نہیں کرتے۔ چڑیاں چہچہاتی ہیں، ان کو اپنی زندگی کا نظام پوری طرح معلوم ہے مگر وہ ہماری قابل فہم زبان میں ہم کو کوئی پیغام نہیں دیتیں۔ ستارے اور سیارے اپنے نظام میں ایک سکنڈ کا فرق کئے بغیر دوڑ رہے ہیں۔ مگر وہ نہیں بتاتے کہ وہ کون سی منزل ہے جس کی طرف انسان کو رواں دواں ہونا چاہئے۔

کائنات کی ہر چیز ایک ہی مقرر راستہ پر چل رہی ہے، حقیر چیونٹی سے لے کر عظیم کہکشانوں تک سب کے سب اپنے مقرر نظام کے اس طرح پابند ہیں جیسے ان کو اپنی راہ عمل پوری طرح معلوم ہو۔ یہاں صرف ایک انسان ہے جو اپنی راہ عمل سے بے خبر ہے۔ ایک باخبر کائنات میں وہ بالکل بے خبر حالت میں کھڑا ہوا تمام چیزوں کو دیکھ رہا ہے۔ وہ ہر چیز کو اپنی منزل کی طرف جاتا ہوا دیکھتا ہے مگر اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ خود کیا کرے اور کدھر جائے۔

کائنات میں جتنی بھی چیزیں ہیں سب کا ایک نظام عمل مقرر ہے جس پر وہ حد درجہ پابندی کے ساتھ قائم ہیں۔ یہاں صرف ایک انسان کا استثناء ہے۔ انسان واحد مخلوق ہے جو کسی نظام میں بندھا ہوا نہیں ہے۔ وہ اختیار رکھتا ہے کہ جو چاہے کرے اور جو چاہے نہ کرے۔ زمین اپنے مدار میں گھومتی ہے۔ وہ دوسرے سیاروں کے

مدار میں داخل نہیں ہوتی۔ مگر انسان کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ ایک متعین صورت حال جہاں دوسری چیزیں ہمیشہ ایک ہی رخ اختیار کرتی ہیں، انسان کے لئے ممکن ہوتا ہے کہ وہ کوئی رخ اختیار کرسکے۔ وہ اپنے "مدار" سے نکل کر دوسرے کے "مدار" میں مداخلت کرنے لگے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کے لئے راہ عمل پانے کا معاملہ اس سے مختلف ہے جو بقیہ کائنات کا ہے۔ بقیہ چیزیں اپنی راہ عمل خود اپنے ساتھ لاتی ہیں مگر انسان کو اپنی راہ عمل باہر سے حاصل کرنا ہے۔

مطالعہ یہ بھی بتاتا ہے کہ انسان اپنی راہ عمل خود دریافت نہیں کرسکتا۔ انسان عقل و فہم رکھتا ہے مگر اس کی عقل و فہم اصل مسئلہ کی نسبت سے اتنی محدود ہے کہ کسی طرح بھی یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنی کوشش سے اس سوال کا جواب معلوم کرسکے۔ پچھلے ہزاروں سال کی تاریخ نے اس کو تجرباتی سطح پر ثابت کردیا ہے۔

کائنات کے اندر اپنے سوال کا جواب نہ پاکر انسان نے خود تحقیق شروع کی۔ مگر نسلوں کی کوششیں بھی اس کو کسی ایسی بات تک نہ پہنچا سکیں جس پر وہ یقین کرسکے۔ اس نے ستاروں اور سیاروں کی حرکت کے اصول معلوم کرلئے مگر انسان کے سفر اور اس کے آغاز وانجام کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ کرسکا۔ اس نے جمادات، نباتات اور حیوانات کا قانون دریافت کرلیا۔ مگر خود انسان کا قانون دریافت کرنے میں ناکام رہا۔ اس نے یہ جان لیا کہ مادہ فنا ہوتا ہے تو انرجی بن جاتا ہے اور انرجی ختم ہوتی ہے تو وہ مادہ کی صورت اختیار کرلیتی ہے مگر انسان مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے اس کی بابت وہ کچھ نہ جان سکا۔ اس نے معلوم کرلیا کہ کائنات کی تمام چیزیں ایک ہی محکم قانون میں بندھی ہوئی ہیں اور اس سے ادنیٰ انحراف کئے بغیر کھرب ہا کھرب سال تک چلتی رہتی ہیں۔ مگر انسان

کا قانون حیات کیا ہو، اس کے بارے میں وہ کچھ معلوم نہ کر سکا۔ اس نے کائنات کی وسعتوں کو اپنے آلات کی مدد سے دیکھ لیا اور انتہائی چھوٹے ایٹم کے اندرونی نظام کا پتہ کر لیا۔ مگر انسان کی حقیقت کیا ہے اور وہ کس منصوبہ کے تحت وجود میں آیا ہے۔ اس کی بابت وہ کچھ نہ جان سکا۔

انسان کی سب سے بڑی ضرورت کے بارے میں انسان کی یہ مجبوری ثابت کرتی ہے کہ اس کو اس بارے میں ایک خصوصی رہنما درکار ہے۔ اس سے پیغمبر کی ضرورت پوری طرح ثابت ہو جاتی ہے۔ انسان اپنی زندگی کو بامعنی بنانے کے لئے پیغمبر کا لازمی طور پر محتاج ہے۔ اس کے بعد جب ہم ان تعلیمات پر غور کرتے ہیں جو پیغمبر نے پیش کی ہیں تو مزید یقین ہو جاتا ہے کہ پیغمبری فی الواقع انسان کی ایک لازمی ضرورت ہے۔ پیغمبر کی بتائی ہوئی باتیں ان تمام سوالات کا تسلی بخش اور مکمل جواب ہیں جو انسان کو در پیش ہیں۔ یہ تعلیمات خود اس بات کا ثبوت ہیں کہ پیغمبر واقعی اللہ کی طرف سے ہے۔ اللہ نے اس کو حقیقت کا علم دے کر انسانوں کی رہنمائی کے لئے بھیجا ہے۔ بقیہ چیزوں کا قانون عمل ان کے پیدا کرنے والے نے اندرونی طور پر ان کے اندر رکھ دیا اور انسان کا قانون عمل پیغمبر کے ذریعہ اس کے پاس بھیجا۔

پیغمبر ہم کو بتاتا ہے کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے اور وہ اپنی غیر معمولی قدرت کے ساتھ اس نظام کو چلا رہا ہے۔ اس جواب سے زیادہ صحیح جواب کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ یہ جواب ایسا ہی ہے جیسے ایک مشین بہت عمدہ چل رہی ہو۔ لوگ اس کی کارکردگی کو دیکھ کر حیران ہوتے ہوں۔ مگر اس کی ساخت اس پر لکھی ہوئی نہ ہو۔ اب ایک واقف کار یہ کہے کہ یہ فلاں کارخانہ کی بنی ہوئی ہے جو دنیا بھر میں انجنیرنگ کا

سب سے اچھا کارخانہ ہے۔ یہ بات معلوم ہوتے ہی دیکھنے والوں کی الجھن ختم ہوجائے گی۔کیوں کہ اب ان کو مشین کی اعلیٰ کارکردگی کی توجیہہ مل گئی۔

اسی طرح ایک عظیم کائنات کا موجود ہونا اور پھر اس کا حد درجہ محکم طریقہ پر چلنا اس کے بارے میں یہ سوال پیدا کرتا ہے کہ وہ کیوں کر بنی اور کیسے چل رہی ہے۔ جب پیغمبر یہ کہتا ہے کہ ایک خدا ہے جس نے اس کو بنایا اور جو اس کو اپنی خدائی طاقتوں سے چلا رہا ہے تو فوراً ہم کو اپنے سوال کا جواب مل جاتا ہے۔ یہ جواب ہمارے لئے ذرا بھی بعید از قیاس نہیں۔کیوں کہ خدا کو ماننا ایسا ہی ہے جیسے اپنے آپ کو ماننا۔ ہم اپنی ذات کی سطح پر ایک ایسے وجود کا تجربہ کر رہے ہیں جو دیکھتا ہے، جو سنتا ہے، جو سوچتا ہے، جو چلتا ہے، جو پکڑتا ہے، جو منصوبہ بناتا ہے، جو واقعات کو ظہور میں لاتا ہے۔ "انسان" کی صورت میں جن قوتوں کو ہم محدود طور پر دیکھ رہے ہیں۔ وہی قوتیں زیادہ کامل طور پر خدا کی صورت میں موجود ہوں تو اس میں تعجب کی بات کیا ہے۔ یہ تو گویا اسی واقعہ کو زیادہ بڑے پیمانے پر ماننا ہے جس کا ہر وقت ہم چھوٹے پیمانہ پر تجربہ کر رہے ہیں۔ "میں" ہوں یہی اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ "خدا" ہے۔

دوسری بات جو پیغمبر بتاتا ہے وہ یہ کہ کائنات بے انجام نہیں۔اس کا ایک انجام ہے جو موت کے بعد سامنے آنے والا ہے۔آدمی کو بظاہر اس دنیا میں جو آزادی حاصل ہے وہ صرف امتحان کے لئے ہے۔یہ آزادی ایک خاص مدت تک ہے۔اس مدت کے ختم ہونے کے بعد موجودہ نظام توڑ دیا جائے گا۔اور نیا زیادہ کامل اور ابدی نظام بنایا جائے گا۔وہاں خدا اپنی طاقتوں کے ساتھ ظاہر ہوجائے گا۔جو اس وقت امتحان کی مصلحت کی بنا پر غیب کے پردہ میں چھپا ہوا ہے۔آج کی دنیا میں ہر ایک کو فائدہ اٹھانے

کا موقع ہے۔ مگر آنے والی دنیا میں خدا کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کا حق صرف ان لوگوں کو ہوگا جنھوں نے حالت غیب میں خدا کی وفاداری کی ہوگی۔ بقیہ تمام لوگ خدا کی نعمتوں سے دور پھینک دئے جائیں گے۔

پیغمبر کی یہ خبر بھی پوری طرح سچائی کے مطابق معلوم ہوتی ہے۔ ایک ایسا خدا جس نے دیکھنے اور سمجھنے والے انسان کو بنایا، کیسی عجیب بات ہوگی کہ انسان یوں ہی پیدا ہوکر مرجائے اور اس کا خدا اس کے سامنے ظاہر نہ ہوکہ وہ اس کو دیکھے اور جانے۔

پھر موجودہ کائنات اتنی باحکمت ہے کہ کسی طرح بھی یہ بات قابل تصور نہیں ہے کہ اس کا کوئی انجام نہ ہو، کوئی ایسا دن نہ آئے جہاں ظلم ظلم کی صورت میں اور انصاف انصاف کی صورت میں نمایاں ہو۔ یہاں دوبارہ پیغمبر کی خبر عین وہی ہے جس کا انسانی فطرت تقاضا کر رہی تھی، ایک ایسی دنیا جہاں عدم سے وجود کے مظاہرے ہوتے ہوں۔ جہاں رات کے بعد دن آتا ہو، جہاں ایک معمولی بیج سے بے شمار بڑے بڑے درخت پیدا ہوتے ہوں۔ جہاں "آج" ہمیشہ "کل" میں تبدیل ہوتا ہو، ایسی دنیا کے بارے میں یہ کہنا کہ اس کی ایک آخرت ہے حد درجہ قابل فہم ہے۔ جو دن ہم ہر روز نکلتا دیکھتے ہیں، یہ اسی کے زیادہ بڑے پیمانے پر نکلنے کی خبر ہے۔ جو کل ہر روز ہمارے اوپر آتی ہے یہ اسی کے زیادہ بڑی صورت میں ظاہر ہونے کی اطلاع ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر ہماری اپنی فطرت کی مانگ کو شعور تک پہنچاتا ہے، جس بات کے اشارے آج بھی کائنات میں موجود ہیں اس کو وہ یقینی علم کا درجہ عطا کرتا ہے۔

پیغمبر نے انسان کے لئے جو راہ عمل بتائی ہے وہ بھی حد درجہ قابل فہم ہے اور اس بات کا ثبوت ہے کہ پیغمبر کا یہ دعویٰ بالکل صحیح ہے کہ وہ خدا کا بھیجا ہوا ہے۔ کیوں

کہ اتنی صحیح بات وہی کہہ سکتا ہے جو خدا کی طرف سے بول رہا ہو۔ پیغمبر یہ بتاتا ہے کہ انسان کے لئے راہ عمل یہ ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کرے۔ عبادت کا مطلب ہے اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دینا۔ اسی سے ڈرنا اور اسی سے محبت کرنا۔ اللہ ہی کو اپنا سب کچھ بنا لینا۔

انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے ایک ایسا وجود ہے جو اپنی توجہات کا ایک مرکز چاہتا ہے۔ اس کو کوئی ایسا نقطہ درکار ہے جس کے اوپر وہ اپنی سوچ اور اپنے جذبات کو مرتکز کر سکے۔ یہ انسان کی ایسی ضرورت ہے جس سے وہ کسی حال میں خالی نہیں ہو سکتا اور نہ کوئی ایسا شخص موجود ہے جو اس سے خالی ہو۔

کسی کا مرکز توجہ اس کے بیوی بچے ہیں۔ کسی کا مرکز اس کا قبیلہ اور برادری ہے۔ کسی کا مرکز توجہ قوم اور وطن ہے۔ کوئی دولت کو اور کوئی اقتدار کو اپنا مرکز توجہ بنائے ہوئے ہے۔ مگر ان میں سے کوئی بھی چیز نہیں جو حقیقۃً اس قابل ہو کہ انسان اس کو اپنا مرکز توجہ بنائے۔ یہ چیزیں آدمی کے فطری جذبہ کا انحراف ہیں نہ کہ آدمی کے فطری جذبہ کا استعمال۔ مرکز توجہ بننے کے قابل وہ ہو سکتا ہے جو انسان کو سہارا دے سکے۔ جو زندگی کے انجام کو بہتر بنانے میں انسان کی مدد کر سکتا ہو۔ مگر ان میں سے کسی چیز کو بھی یہ طاقت حاصل نہیں۔ یہ تمام چیزیں خود ہی دوسروں کی محتاج ہیں۔ پھر وہ کسی دوسرے کی کیا مدد کر سکتی ہیں۔

پھر مرکز توجہ بننے کے قابل وہ ہے جس کو بیک وقت سارے انسان مرکز توجہ بنائیں اور اس کے باوجود معاشرہ میں کوئی بگاڑ پیدا نہ ہو۔ مگر ان میں سے ہر چیز کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ وہ تمام چیزیں جن کو آدمی عام طور پر مرکز توجہ بناتا ہے وہ محدود ہیں۔ ایک آدمی کا انھیں پانا ہمیشہ دوسرے آدمی کی محرومی کی قیمت پر ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ سماج میں مستقل چھین جھپٹ جاری رہتی ہے۔ایک شخص جب پاتا ہے تو وہ دوسرے شخص سے چھین رہا ہوتا ہے۔حقیقت یہ ہے یہ صرف خدا ہی کی شان ہے کہ بیک وقت سارے انسان اس کو پانے کے لئے دوڑیں اور پھر بھی لوگوں میں کوئی ٹکراؤ پیدا نہ ہو۔کیوں کہ خدا مادی چیزوں سے بلند ہے، خدا ہر قسم کی محدودیت سے پاک ہے۔

انسانی سماج کا ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ خواہ کتنا ہی اچھا قانون بنایا جائے، انسان اس سے بچنے کا راستہ تلاش کر لیتا ہے۔کسی کے پاس طاقت ہے تو وہ طاقت کے بل پر دھاندلی کرتا ہے۔کسی کے پاس دولت ہے تو وہ دولت کے ذریعہ انصاف کو خرید لیتا ہے۔کسی کے پاس الفاظ ہیں تو وہ خوبصورت الفاظ کے ذریعہ اپنے ظلم کو انصاف ثابت کرتا ہے۔غرض ہر ایک اپنے ناحق کو حق ظاہر کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی تدبیر پا لیتا ہے۔مگر جب خدا کو درمیان میں کھڑا کر دیا جائے تو ہر آدمی محسوس کر لیتا ہے کہ اس کی تدبیریں بے معنی ہیں۔تمام تدبیریں اسی وقت تک تدبیریں ہیں جب تک معاملہ انسان اور انسان کے درمیان ہو۔جب معاملہ کو انسان اور خدا کا معاملہ بنا دیا جائے تو ہر آدمی مکمل طور پر سنجیدہ اور محتاط ہو جاتا ہے۔کیونکہ خدا سے نہ کوئی بات چھپائی جا سکتی اور نہ وہاں کسی قسم کا زور چل سکتا۔حقیقت یہ کہ خدا پرستی ہی واحد بنیاد ہے جس سے لوگوں میں قانون کے احترام کا جذبہ پیدا کیا جا سکتا ہے۔اس کے سوا کوئی بنیاد نہیں جس سے یہ مقصد حاصل ہو سکے۔

دنیا میں صحیح نظام بنانے کے لئے سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت پڑتی ہے وہ قربانی ہے۔کہیں کسی کی رائے کے مقابلہ میں اپنی رائے کو چھوڑنا پڑتا ہے۔کہیں اپنے

ایک کریڈٹ کو دوسرے کے حوالے کرنے پر راضی ہونا پڑتا ہے۔ کہیں اپنے گھر والوں کے مفاد کے مقابلہ میں دوسروں کے مفاد کو ترجیح دینی پڑتی ہے۔ کہیں اپنی محنت سے کمائے ہوئے مال کو دوسروں کے حوالے کر دینا پڑتا ہے۔ کہیں ایک ایسے کام میں اپنی قوتیں کھپانے کا سوال ہوتا ہے جس میں بظاہر کچھ ملنے والا نہیں۔

جب تک افراد میں اس قسم کی قربانی کا مزاج نہ ہو حقیقی معنوں میں کسی درست نظام کا قائم ہونا ممکن نہیں۔ اس کے بغیر ہر آدمی اپنی بات پر اصرار کرے گا اور نتیجۃً پورا سماج چھین جھپٹ کا سماج بن جائے گا۔ اگر یہی موجودہ دنیا سب کچھ ہو تو آدمی اس قسم کی قربانی کیوں کرے۔ یہی وجہ ہے کہ جس سماج میں خدا کو چھوڑ کر دوسری چیزوں کو مرکزِ توجہ بنایا جائے وہاں مستقل فساد برپا رہتا ہے۔ لوگ قربانی دینے پر تیار نہیں ہوتے اس لئے صالح ماحول بننے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ مگر پیغمبر زندگی کے جس مقصد کی نشان دہی کرتا ہے اس میں یہ مسئلہ نہایت خوبی کے ساتھ حل ہو جاتا ہے۔ اب قربانی کرنے کے لئے بہت بڑا محرک مل جاتا ہے۔ اب انسان جان لیتا ہے کہ اس کی ہر قربانی کی اللہ کے یہاں بہت بڑی قیمت ہے جو مرنے کے بعد اس کو ابدی زندگی میں لوٹائی جائے گی۔ یہ ذہن انسانی سماج میں ہر قسم کے ظلم کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔ اور حق و انصاف کے لئے مضبوط ترین بنیاد فراہم کر دیتا ہے۔ اب ہر شخص اس قربانی کے لئے تیار ہو جاتا ہے جو ماحول کو صالح بنانے کے لئے ضروری ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم جو دین لے کر آئے وہ وہی دین ہے جو خدا کے دوسرے پیغمبر لے کر آئے تھے۔ مگر دوسرے پیغمبروں کا دین ان کے بعد محفوظ نہ رہ سکا ان کے بعد ان کے دین کے ماننے والے اتنے طاقت ور ثابت نہ ہو سکے کہ ان کے

دین کو اس کی اصلی صورت میں محفوظ رکھ سکتے۔ پیغمبر اسلام کو اللہ تعالیٰ نے آخری نبی کی حیثیت سے بھیجا اور ان کی خصوصی مدد کر کے ان کو تمام قوموں اور مذہبوں کے اوپر غالب کر دیا۔ آپ کی یہ غیر معمولی فتح ایک طرف آپ کے پیغمبر خدا ہونے کی دلیل بن گئی۔ آپ کی کامیابی اتنی غیر معمولی تھی کہ دنیا میں کبھی کسی کو ایسی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ یہ واقعہ اس بات کا ایک محسوس ثبوت ہے کہ آپ خدا کی طرف سے تھے اور خدا نے اپنی خصوصی مدد سے آپ کو یہ غلبہ اور کامیابی عطا فرمائی۔ کوئی عام آدمی کبھی اس قسم کی کامیابی پر قادر نہیں ہو سکتا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح اپنے تمام دشمنوں کو زیر کیا اور آپ کو عرب میں اور عرب کے باہر جو کامیابی حاصل ہوئی وہ ساری انسانی تاریخ میں انوکھی اور بے مثال ہے۔ مورخین نے کھلے طور پر یہ تسلیم کیا ہے کہ ایسی غیر معمولی کامیابی نہ آپ سے پہلے کسی شخص کو حاصل ہوئی اور نہ آپ کے بعد کوئی ایسا شخص ہے جو ایسی غیر معمولی کامیابی تک پہنچا ہو۔

پیغمبر اسلام جیسا کامیاب انسان ساری معلوم تاریخ میں صرف ایک ہی نظر آتا ہے۔ یہ آپ کی ایسی ناقابل انکار خصوصیت ہے کہ جو لوگ آپ پر ایمان نہیں رکھتے وہ بھی جب تاریخ کے بڑوں کی فہرست بناتے ہیں تو وہ مجبور ہوتے ہیں کہ آپ کو اس فہرست میں سب سے اوپر رکھیں۔

آپ کی اس انوکھی اور استثنائی کامیابی کو عام طور پر لوگ بس ایک انسان کا کارنامہ سمجھتے ہیں۔ وہ اس کا حق اتنا ہی سمجھتے ہیں کہ بڑھے ہوئے لفظوں میں آپ کی شخصی عظمت کا اعتراف کر لیں۔ مگر بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ سوال یہ ہے کہ یہ کامیابی اگر عام

معنوں میں صرف ایک انسانی کامیابی تھی تو اس میں یہ استثنائی خصوصیت کیوں ہے۔ کیا وجہ ہے کہ تاریخ اس کی کوئی دوسری مثال پیش نہیں کرتی۔ ساری طویل تاریخ میں ہم کوئی دوسرا انسان نہیں پاتے جس نے اتنی بڑی کامیابی حاصل کی ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ آپ کی کامیابی کا استثنائی پہلو ایک زبردست نشانی ہے۔ وہ اس واقعہ کے غیر انسانی ہونے کو بتاتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ یہ کامیابی آپ کو براہ راست خدا کی مدد سے حاصل ہوئی۔ اور اس لئے حاصل ہوئی کہ آپ خداوند ذوالجلال کے پیغمبر اور اس کے نمائندہ تھے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی استثنائی کامیابی آپ کے سچے پیغمبر خدا ہونے کا ثبوت ہے نہ کہ سادہ معنوں میں محض آپ کے عظیم انسان ہونے کا ثبوت۔

دوسری طرف آپ کی اسی کامیابی کے ذریعہ آپ کے لائے ہوئے دین کی مستقل حفاظت کا انتظام ہوگیا۔ آپ کی اس کامیابی کی وجہ سے آپ کے ماننے والوں کی حکومت ایک بہت بڑے رقبہ پر قائم ہوگئی۔ یہ حکومت آپ کے دین کی دائمی محافظ بن گئی۔ چنانچہ آپ کی آمد کو چودہ سوسال ہوگئے اور آج تک آپ کے دین میں کوئی تبدیلی نہ ہوسکی۔ وہ اب بھی اسی خالص صورت میں محفوظ ہے جس صورت میں آپ نے اس کو دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب کوئی پیغمبر آنے والا نہیں۔ آپ قیامت تک کے لئے تمام انسانوں کے اوپر خدا کے پیغمبر ہیں۔ نیا پیغمبر آنے کی ضرورت ہمیشہ اس لئے پڑتی ہے کہ خدا کا دین اپنی اصلی صورت میں محفوظ نہ رہا ہو۔ پچھلے زمانہ میں بار بار ایسا ہوا کہ آسمانی کتاب کی حامل قومیں اپنی کتاب کو ضائع کرتی رہیں۔ اس

لئے بار بار نبی آئے تاکہ خدا کی تعلیمات کو زندہ کریں اور ان کو دوبارہ ان کی صحیح صورت میں لوگوں کے سامنے پیش کر دیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی صورت میں جو کتاب پیش کی وہ مکمل طور پر اپنی ابتدائی صورت میں محفوظ ہے اور پریس کا دور آنے کے بعد آخری طور پر محفوظ ہو چکی ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ آپ آج بھی ایک زندہ نبی کی حیثیت سے ہمارے درمیان موجود ہیں۔ کیوں کہ آپ کے اقوال، آپ کے حالات، آپ کی پیغمبرانہ جدوجہد، غرض آپ کے پورے عمل کا ریکارڈ اس طرح مکمل طور پر محفوظ ہے کہ جب ہم اس کو پڑھتے ہیں تو گویا کہ ہم آپ کو اپنے درمیان محسوس کرنے لگتے ہیں۔ بحیثیت رسول آپ نے جو کچھ کیا وہ سب کا سب ہم شروع سے آخر تک آج بھی معتبر کتابوں میں دیکھ رہے ہیں۔ ایسی حالت میں اب نیا نبی آنے کی کیا ضرورت۔
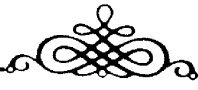
آخرت

آخرت

آخرت میں آدمی کو جو بدلہ دیا جائے گا وہ دنیا میں اس کے عمل ہی کا اخروی پہلو ہوگا۔ اس لئے عمل اور بدلہ دونوں ایک دوسرے کے انتہائی مطابق ہوں گے۔ ایک شخص سونا جمع کئے ہوئے ہے اور اللہ کا حصہ اللہ کے راستہ میں نہیں دیتا تو وہ سونا گویا آگ کا انگارہ ہے۔ موت کے بعد یہ سونا آگ کی صورت اختیار کرکے آدمی کے ساتھ چپک جائے گا (التوبہ) حدیث میں اس قسم کی بہت سی مثالیں دی گئی ہیں کہ آدمی کا عمل اور اس کے اخروی نتائج کس طرح ایک دوسرے کے مطابق ہوں گے۔

معراج کے سفر سے متعلق جو روایات ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آسمانی سفر میں آپ کو جو چیزیں دکھائی گئیں ان میں وہ عالم مثال بھی تھا جہاں انسان کے دنیوی اعمال اپنی اخروی صورت میں نظر آتے ہیں۔ یہاں ایک طرف آپ کو اچھے اعمال کی اخروی صورتیں دکھائی گئیں۔ اسی طرح آپ کو تفصیل کے ساتھ برے اعمال کی اخروی صورتیں بھی دکھائی گئیں۔

آپ نے دیکھا کہ کچھ لوگ ہیں جن کے سر پتھروں سے کچلے جارہے ہیں۔ آپ نے پوچھا یہ کون ہیں۔ فرشتہ نے بتایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی سرگرانی ان کو نماز کے لئے اٹھنے نہ دیتی تھی۔ اسی طرح آپ نے کچھ لوگ دیکھے جن کے کپڑوں میں بہت پیوند لگے

ہوئے تھے اور وہ جانوروں طرح گھاس چر رہے تھے۔ آپ نے پوچھا یہ کون ہیں۔
فرشتہ نے بتایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے مال کو اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرتے تھے۔
پھر آپ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ لکڑیوں کا گٹھا جمع کرکے اٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔
اور جب وہ گٹھا اس سے نہیں اٹھتا تو وہ اس میں کچھ اور لکڑیاں بڑھا لیتا ہے۔ آپ
نے پوچھا یہ کون ہے۔ فرشتہ نے بتایا کہ یہ وہ شخص ہے جس پر ذمہ داریوں اور
امانتوں کا اتنا بوجھ تھا کہ وہ اٹھا نہ سکتا تھا مگر وہ ان کو کم کرنے کے بجائے اور
زیادہ ذمہ داریوں کا بوجھ اپنے اوپر ڈال لیتا تھا۔

پھر آپ نے دیکھا کہ کچھ لوگ ہیں جن کی زبانیں اور ہونٹ قینچیوں سے کاٹے
جا رہے ہیں۔ آپ نے پوچھا یہ کون لوگ ہیں۔ فرشتہ نے بتایا کہ یہ وہ مقرر ہیں جو
بے روک ٹوک زبان چلاتے تھے اور غیر ذمہ دارانہ باتیں کہہ کر فتنہ برپا کرتے تھے۔
ایک جگہ آپ نے دیکھا کہ ایک پتھر میں چھوٹا سا سوراخ ہوا اور اس میں سے ایک
بڑا سا بیل نکل آیا۔ اس کے بعد وہ بیل دوبارہ اسی سوراخ میں جانے کی کوشش
کرنے لگا۔ مگر کوشش کے باوجود وہ دوبارہ اس کے اندر نہ جا سکا۔ آپ نے پوچھا
یہ کیا معاملہ ہے۔ فرشتہ نے بتایا کہ یہ اس آدمی کی مثال ہے جو بے پروائی کے ساتھ
ایک فتنہ کی بات کہہ دیتا ہے۔ اس کے بعد اس کے برے نتائج دیکھ کر اس کو
واپس لینا چاہتا ہے مگر واپس نہیں لے سکتا۔ اسی طرح ایک جگہ آپ نے دیکھا کہ کچھ
لوگ ہیں جو خود اپنے جسم کا گوشت کاٹ کاٹ کر کھا رہے ہیں۔ آپ نے پوچھا یہ
کون لوگ ہیں۔ فرشتہ نے بتایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے دوسرے بھائیوں پر طعن
و طنز کرتے تھے۔

کچھ اور لوگوں کو آپ نے دیکھا۔ ان کے ناخن تانبے کے تھے اور وہ اس سے اپنے منھ اور سینے نوچ رہے تھے۔ آپ نے پوچھا یہ کون لوگ ہیں۔ فرشتہ نے بتایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو دوسروں کے پیچھے ان کی برائیاں کرتے تھے اور ان کی عزت و آبرو پر حملے کرتے تھے۔ کچھ لوگوں کو آپ نے دیکھا۔ ان کے ہونٹ اونٹوں سے ملتے جلتے تھے اور وہ آگ کھا رہے تھے۔ آپ نے پوچھا یہ کون لوگ ہیں۔ فرشتہ نے بتایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو یتیموں کا مال دنیا میں کھاتے تھے۔ پھر آپ نے دیکھا کہ کچھ لوگ ہیں جن کے پیٹ بہت بڑے ہیں اور وہ سانپوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ آنے جانے والے ان کو روندتے ہوئے گزر جاتے ہیں، وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتے۔ آپ نے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں۔ فرشتہ نے بتایا کہ یہ سود کھانے والے لوگ ہیں۔ پھر کچھ لوگ دکھائی دئے جن کے ایک جانب اچھا گوشت رکھا ہوا تھا اور دوسری جانب سڑا ہوا گوشت جس سے سخت بدبو آرہی تھی۔ وہ اچھے گوشت کو چھوڑ کر سڑا ہوا گوشت کھا رہے تھے۔ آپ نے پوچھا یہ کون لوگ ہیں۔ فرشتہ نے بتایا کہ یہ وہ مرد اور عورتیں ہیں جنھوں نے جائز بیویوں اور شوہروں کو چھوڑ کر حرام سے اپنی خواہش پوری کی۔

جنت کا معاملہ بھی یہی ہے۔ قرآن میں جنت کو عطاء متشابہ کہا گیا ہے، یعنی ایسا انعام جو آدمی کے عمل سے ملتا جلتا ہو۔ ارشاد ہوا ہے کہ جنت میں جب کوئی پھل انھیں کھانے کے لئے دیا جائے گا تو اہل جنت کہیں گے کہ ایسے ہی پھل اس سے پہلے ہم کو دنیا میں دئے گئے تھے اور ان کو دنیا کے پھلوں سے ملتے جلتے پھل دئے جائیں گے (بقرہ ۲۵) اس کا مطلب یہ ہے کہ آخرت کے انعامات دنیا کے عمل کے عین مطابق و مماثل ہوں گے۔ دنیا میں کسی بندۂ خدا کو جس عمل کی توفیق ملی ہوگی اسی سے ملتا جلتا بدلہ جنت میں اس کے حصہ

میں آئے گا۔

معراج کے سفر میں ایک جگہ آپ نے دیکھا کہ کچھ لوگ کھیتی کاٹ رہے ہیں۔ وہ جتنی کھیتی کاٹتے ہیں اتنی ہی ان کی کھیتی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرشتہ سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں۔ آپ کو بتایا گیا کہ یہ خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے لوگ ہیں۔

دنیا میں آدمی کا اصل امتحان یہ ہے کہ وہ کسی صورت حال میں کس قسم کا جواب دیتا ہے۔ پتھر کے ساتھ کوئی صورت حال پیش آئے تو وہ اس کے جواب میں کوئی رویہ ظاہر نہیں کرتا۔ مگر انسان ایک احساس اور شعور رکھنے والی مخلوق ہے۔ انسان کے ساتھ جب کوئی صورت حال پیش آتی ہے تو وہ اس کے اندر ہلچل پیدا کرتی ہے۔ وہ اس کے جواب میں اپنے ہاتھ یا زبان سے کوئی ردعمل ظاہر کرتا ہے۔ اسی میں آدمی کا اصل امتحان ہے۔ ہر ایسے موقع پر خدا یہ دیکھتا ہے کہ آدمی نے اپنے فکر وعمل کی آزادی کو کس رخ پر استعمال کیا۔ اس نے گالی کے جواب میں گالی دی یا گالی کے جواب میں اس کی زبان سے دعائیں نکلیں۔

ہر صورت حال جو دنیا میں آدمی کے ساتھ پیش آتی ہے اس کے جواب کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک جہنمی جواب، دوسرا جنتی جواب۔ جہنمی جواب وہ ہے جو اللہ کی مرضی کے مطابق نہیں ہے اور جنتی وہ ہے جو اللہ کی مرضی کے مطابق ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایک جواب وہ ہے جو شیطانی اخلاقیات کے مطابق ہو، ایسے لوگ جہنم کے مستحق قرار پائیں گے۔ دوسرا جواب وہ ہے جو خدائی اخلاقیات کے مطابق ہو، ایسے لوگ جنت کے لطیف ماحول میں بسائے جائیں گے۔

شیطانی اخلاقیات یہ ہے کہ جب کوئی ناخوش گوار صورت حال پیش آئے تو آدمی بے خوف ہو کر جوابی کارروائی کرنے لگے۔ وہ نفرت کا جواب نفرت سے دے اور غصہ کے مقابلہ میں غصہ کا تحفہ پیش کرے۔ اس کے برعکس خدائی اخلاقیات یہ ہے کہ آدمی اللہ سے ڈرے۔ وہ وقتی جذبات سے اوپر اٹھ کر سوچے اور نفرت اور محبت کی نفسیات سے بلند ہو کر معاملہ کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے میرے رب نے حکم دیا ہے کہ جو مجھ سے کٹے میں اس سے جڑوں، جو مجھ کو محروم کرے میں اس کو دوں، جو مجھ پر ظلم کرے میں اس کو معاف کر دوں (وان اصل من قطعنی واعطی من حرمنی، واعفو عمن ظلمنی)

اس طرح کے مختلف احکام ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن سے یہ مطلوب ہے کہ وہ لوگوں کے سلوک سے بالاتر ہو کر ان کے ساتھ معاملہ کرے۔ وہ منفی نفسیات کے مواقع پر مثبت نفسیات ظاہر کرے۔ لوگوں کے درمیان زندگی گزارتے ہوئے بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ناخوش گوار واقعات پیش آتے ہیں اور آدمی کے اندر مخالفانہ جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ ایسے مواقع پر مومن کو یہ کرنا ہے کہ مخالفانہ جذبات کو اندر ہی اندر دبالے۔ تلخی کے باوجود وہ دوسروں کے ساتھ بہتر جذبات کے ساتھ پیش آئے۔

جنت ایک نہایت لطیف اور پاکیزہ مقام ہے جو اللہ خصوصی اہتمام کے ساتھ اپنے نیک بندوں کے لئے بنائے گا:

عن جابر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اھل الجنۃ یاکلون فیھا و یشربون ولا یتفلون ولا یبولون ولا	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت کے لوگ کھائیں گے اور پئیں گے مگر وہ نہ تھوکیں گے اور نہ پیشاب کریں گے اور نہ

يتغوطون ولا يمتخطون۔ قالوا فما بال الطعام قال جشاء ورشح كرشح المسك يلهمون التسبيح والتحميد كما تلهمون النفس (مسلم)

پاخانہ کریں گے۔ لوگوں نے پوچھا پھر کھانے کا کیا ہوگا۔ فرمایا: ڈکار اور پسینہ نکلے گا جو مشک کی طرح خوشبو دار ہوگا۔ ان کو حمد اور تسبیح اسی طرح الہام کی جائے گی جس طرح تم سانس لیتے ہو۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت ایک ایسی دنیا ہے جہاں میل اور کثافت بھی خوشبو کی صورت میں خارج ہوتی ہے۔ پھر ایسی دنیا میں وہ لوگ کیوں کر داخل ہوں گے جو اپنی کثافت کو صرف کثافت کی صورت میں خارج کرنا جانتے ہوں۔ بغض، نفرت، حسد، انتقام اور کبر وظلم یہ سب انسان کی نفسیات کا میل کچیل ہے۔ جو لوگ اپنے میل کچیل کو صرف میل کچیل کی صورت میں ظاہر کرنا جانتے ہوں وہ جنت میں بسائے جانے کے قابل نہیں۔

جنت خدا کے ان بندوں کی کالونی ہے جو اپنے اندر کے میل کو بھی پاکی کی صورت میں خارج کرتے ہیں۔ جنت میں وہ لوگ بسائے جائیں گے جو نفرت کے مواقع پر محبت کریں۔ جو انتقام کے مواقع پر معاف کر دیں۔ جو حسد اور بغض کے مواقع پر خیر خواہی کا ثبوت دیں۔ جو کبر کے مواقع پر خاکساری دکھائیں اور ظلم کے مواقع پر انصاف کا رویہ اختیار کریں۔ یہ گویا اپنے میل اور کثافت کو خوشبو کی صورت میں ظاہر کرنا ہے، انھیں خصوصیات والے لوگ جنت کی کالونیوں میں بسائے جائیں گے۔

دنیا کو اس ڈھنگ پر بنایا گیا ہے کہ یہاں بار بار آدمی کو ناخوشگوار صورت حال سے سابقہ پیش آئے۔ یہ موجودہ دنیا کے دارالامتحان ہونے کا تقاضا ہے۔ ان ناخوشگوار مواقع پر جو شخص مثبت ردعمل کا اظہار کرے گا وہ جنت کا مستحق بنا اور جو

منفی جذبات کا شکار ہو جائے اس نے اگلی زندگی میں اپنے لئے جنت کا استحقاق کھو دیا۔

جنت کی فضاؤں میں بسنے کے قابل وہ لوگ ہیں جن کا یہ حال ہو کہ ان کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آئے تو وہ مایوس نہ ہوں بلکہ صبر کا طریقہ اختیار کریں۔ کسی سے ان کو تکلیف پہنچے تو اس کے حق میں دعائیں دیں۔ کسی سے معاملہ پڑے تو انصاف کے مطابق اس کے حقوق ادا کریں۔ کوئی تنقید کرے تو اس کو برا مانے بغیر ٹھنڈے دل سے سنیں۔ کسی سے خواہ کتنی ہی شکایت ہو اس کے بارہ میں عدل کا رویہ نہ چھوڑیں۔ جب بھی کسی سے معاملہ پڑے تو دوسرے شخص کو ان سے بہتر سلوک کا تجربہ ہو۔ حتیٰ کہ دوسروں کے ناخوشگوار رویہ سے اپنے سینہ میں اگر نفرت و عداوت کے جذبات پیدا ہوں تب بھی وہ ان کو پی جائیں۔ اپنے مخالفانہ جذبہ کو وہ خیر خواہی اور انصاف کی صورت میں ظاہر کریں۔ وہ دنیا کی زندگی میں خدا کا ایسا پھول بن جائیں جو اپنی کثافت کو بھی خوشبو کی صورت میں ظاہر کرتا ہے۔ ایسی پاک زندگی گزارنے کی توفیق ان لوگوں کو ملتی ہے جو اللہ کو اس طرح یاد کرنے لگیں جس طرح کوئی آدمی سانس لیتا ہے۔ وہ اللہ کو اس طرح پالیں کہ وہ ان کی روح کے اندر تیر جائے۔ وہ ان کے دل کی دھڑکنوں میں شامل ہو جائے۔ وہ اللہ کے خوف و محبت میں نہا اٹھیں۔

وہ مواقع جب کہ آدمی کے اندر سرکشی کی آگ بھڑکتی ہے اس وقت مومن کو تواضع کے ساتھ جھک جانا ہے۔ جب نفرت کے جذبات امنڈتے ہیں اس وقت اس کو محبت کا رویہ اختیار کرنا ہے۔ جب بدخواہی کی نفسیات ابھرتی ہے اس وقت اس کو خیر خواہی کا ثبوت دینا ہے۔ جب بددعا کے کلمات زبان سے نکلتے ہیں اس وقت اس کو دعا کے کلمات اپنی زبان سے ادا کرنا ہے۔ جب حقوق کو دبانے کا خیال

آنے لگتا ہے اس وقت حقوق کو پورے انصاف کے ساتھ لوٹاتا ہے۔ جب حق کا اعتراف کرنے میں اپنا وقار گرتا ہوا نظر آتا ہے اس وقت وقار کا خیال چھوڑ کر حق کا اعتراف کر لیتا ہے۔ جب کسی کے خلاف جوابی کارروائی کا ذہن ابھرتا ہے اس وقت جوابی کارروائی سے اپنے کو روک کر مخالف کے ساتھ وہی کرتا ہے جو خیر خواہی اور انصاف کے تقاضے کے مطابق ہو۔

اگر آپ ٹرک پر سوار ہوں تو سڑک پر دوڑتا ہوا ٹرک آپ کو زبردست جھٹکے دے گا۔ اس کے برعکس جب آپ ایک اچھی کار پر بیٹھتے ہیں تو تیز دوڑتے ہوئے بھی کار آپ کو جھٹکے نہیں دیتی۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ کار کے پہیہ کے ساتھ شاک ایبزاربر لگا ہوا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے کار اپنے تمام جھٹکوں کو اپنے پہیہ پر سہہ لیتی ہے، وہ جھٹکے کو مسافر تک نہیں پہنچنے دیتی۔ اس کے برعکس ٹرک میں اس قسم کا شاک ایبزاربر نہیں ہوتا اس لئے اس کے تمام جھٹکے مسافر تک پہنچتے رہتے ہیں۔

اللہ سے بے خوف آدمی ٹرک کی مانند ہے۔ وہ اپنے اندر کے نفسیاتی جھٹکوں کو برداشت نہیں کرتا۔ وہ ان کو دوسروں کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس اللہ سے ڈرنے والا آدمی کار کی مانند ہوتا ہے، وہ تمام "جھٹکوں" کو اپنے اوپر سہہ لیتا ہے، ان کو دوسرے انسان تک منتقل ہونے نہیں دیتا۔ اسی کا نام صبر ہے۔ صبر یہ ہے کہ لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے جو ناخوشگواریاں پیش آئیں ان کو آدمی اندر ہی اندر سہہ لے، ان کے اثرات دوسروں تک نہ پہنچنے دے۔ ناخوشگواری کے جھٹکوں کو اپنے اوپر لے کر دوسروں کی طرف خوشگواری کو منتقل کرے۔ یہی وہ صلاحیت ہے جو آدمی کو جنت میں آباد کئے جانے کے قابل بناتی ہے۔ جنت وہ
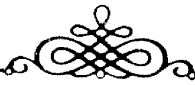
لطیف مقام ہے جہاں کثافت بھی بہ شکل خوشبو ظاہر ہوگی۔ ایسی لطیف آبادی میں رہنے کا مستحق صرف وہ شخص قرار دیا جائے گا جس نے دنیا کی زندگی میں یہ ثبوت دیا ہو کہ اپنی نفسیاتی کثافت کو وہ خوشبو کی صورت میں خارج کرسکتا ہے، کثافت کا خوشبو کی صورت میں ظاہر ہونا موجودہ دنیا میں نفسیاتی اعتبار سے ہوتا ہے۔ آخرت میں یہی واقعہ اللہ کے حکم کے تحت مادی صورت میں پیش آئے گا۔

ایک حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ یہ آدمی کے اپنے اعمال ہیں جو آخرت میں اس کو لوٹائے جائیں گے (انما ھی اعمالکم ترد الیکم) دنیا میں آدمی کے اخلاقی اعمال آخرت میں مادی نتائج کی صورت اختیار کریں گے۔ ہر واقعہ جو دنیا میں پیش آتا ہے اس میں آدمی کے لئے دو قسم کے جواب کا امکان رہتا ہے۔ اسی سے فیصلہ ہوتا ہے کہ کون جنتی ہے اور کون جہنمی۔

کوئی حق بات سامنے آتی ہے، اب ایک شخص اس کا اعتراف کرلیتا ہے اور دوسرا شخص انکار کرتا ہے۔ کوئی معاملہ پڑتا ہے، اس میں ایک شخص انصاف پر قائم رہتا ہے اور دوسرا ظلم پر اتر آتا ہے۔ کوئی ناموافق صورت حال پیش آتی ہے، اب ایک شخص تواضع کا انداز اختیار کرتا ہے اور دوسرا شخص سرکشی کرنے لگتا ہے۔ کوئی باہمی قضیہ ابھرتا ہے، اب ایک شخص محبت اور خیر خواہی کا رویہ اپناتا ہے اور دوسرا شخص نفرت اور انتقام کا۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ردعمل ہیں اور یہی آخرت کی زندگی میں آدمی کے انجام کی تشکیل کررہے ہیں۔ ہمارے اخلاقی اعمال جب مادی صورت اختیار کریں تو انھیں میں سے ایک صورت کا نام جنت ہوتا ہے اور دوسری صورت کا نام جہنم۔

ارکانِ اسلام

ارکان اسلام

عن ابی عبدالرحمٰن عبداللہ بن عمر بن الخطاب قال سمعتُ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول : بُنی الاسلامُ علیٰ خمسٍ شھادۃِ اَنْ لا الٰہ الا اللہ و اَنَّ محمداً عبدہٗ ورسولہٗ ، و اقام الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ وحج البیت ، وصوم رمضانَ (رواہ البخاری ومسلم)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے ہوئے سنا۔ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے۔ گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور محمد اس کے بندے اور رسول ہیں۔ اور نماز قائم کرنا۔ اور زکوٰۃ دینا اور بیت اللہ کا حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔

بعض روایتوں میں یہ الفاظ ہیں کہ اسلام کی تعمیر پانچ ستونوں (خمس دعائم) پر کی گئی ہے۔ (کتاب الصلوٰۃ محمد بن نصر المروزی) ایک عمارت اپنی تفصیلی صورت میں بہت سے اجزاء کا مجموعہ ہوتی ہے۔ مگر ساری عمارت جس چیز کے اوپر کھڑی ہوتی ہے وہ چند کھمبے (Pillars) ہوتے ہیں۔ اسی طرح اسلام کے لئے بھی یہ پانچ چیزیں کھمبے کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان کے مضبوط ہونے سے اسلام مضبوط ہوتا ہے اور ان کے کمزور ہونے سے اسلام کمزور ہوجاتا ہے۔ ہر آدمی کی ہستی ایک زمین کی مانند ہے۔ اگر وہ اپنی اس "زمین" پر خدا کی پسند والی عمارت کھڑی کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے وہ ان پانچ کھمبوں کو پوری مضبوطی کے ساتھ قائم کرے۔ ان کھمبوں کو گاڑے

بغیر نہ فرد کی سطح پر اسلام کا ظہور ہو سکتا ہے اور نہ سماج کی سطح پر۔

اسلام آدمی کے اندر جو زندگی پیدا کرنا چاہتا ہے وہ ایک لفظ میں عبادت یا خدا پرستی کی زندگی ہے۔ تاہم اپنی تفصیلی صورت میں وہ پانچ چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے: ایمان نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج۔ یہ پانچ چیزیں پانچ رسمیات نہیں ہیں بلکہ پانچ اوصاف ہیں۔ یہ ان مطلوب چیزوں کا خلاصہ ہے جو ہمارا مالک ہماری زندگیوں میں دیکھنا چاہتا ہے۔ اگر یہ پانچ اوصاف آدمی کے اندر حقیقی طور پر پیدا ہو جائیں تو گویا اس کے اندر وہ بنیادی صلاحیت پیدا ہو گئی جس کے بعد یہ امید کی جا سکتی ہے کہ اس کی زندگی میں اس ربانی کردار کا ظہور ہو جس کو اسلام ایک ایک شخص کی زندگی میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔

ایمان کا مطلب خدائی حقیقتوں پر یقین ہے۔ نماز کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی اللہ کی بڑائی کے آگے اس طرح جھکے کہ اپنی بڑائی کا احساس اس کے اندر سے ختم ہو جائے۔ روزہ اللہ کے بھروسے پر صبر کرنے کا نام ہے۔ زکوٰۃ یہ ہے کہ آدمی دوسرے کا حق پہچانے تاکہ خدا اس کو اس کے حصہ سے محروم نہ کرے۔ حج سے مراد یہ ہے کہ خدا کے بندے خدا کے گرد متحد ہو جائیں۔ یہ سب اپنی اپنی حقیقت کے اعتبار سے اوصاف ہیں نہ کہ محض خارجی مراسم۔ گویا کہ یقین، بے نفسی، صبر، حق شناسی اور اتحاد وہ پانچ صفاتی کھمبے ہیں جن کے اوپر اسلامی زندگی کا گھر بنتا ہے۔

ایمان

اللہ کو اپنا الٰہ بنانے کا اقرار اس کو اپنا سب کچھ بنانے کا معاہدہ ہے۔ یہ اللہ کو اپنے احساسات اور جذبات کا مرکز بنانا ہے۔ یہ اپنے آپ کو مکمل طور پر اللہ کے حوالے

کرنا ہے۔ یہ اس بات کا فیصلہ کرنا ہے کہ آدمی اپنی امیدوں اور تمناؤں، اپنے اندیشوں اور التجاؤں کا مرکز اللہ کو بنائے گا۔ وہ کہیں اور جینے کے بجائے اپنے رب میں جئے گا۔

آدمی کی امیدیں اور اس کے احساسات جہاں اٹکے ہوئے ہوں، وہیں وہ آدمی جی رہا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو ہر آدمی، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، کہیں نہ کہیں جی رہا ہوتا ہے۔ کوئی اپنے گھر بار اور اپنے بال بچوں میں جیتا ہے۔ کوئی اپنے معاش اور کاروبار میں جیتا ہے۔ کوئی اپنے سیاسی مشاغل اور قیادتی مصروفیات میں جیتا ہے، کوئی اپنی عزت اور اقتدار کے خوابوں میں جیتا ہے۔ غرض ہر آدمی کہیں نہ کہیں جی رہا ہے۔ مگر یہ تمام جینا جاہلیت کا جینا ہے۔ یہ اپنا آشیانہ ایسی شاخوں پر بنانا ہے جن کا حقیقۃً کوئی وجود نہیں۔ حقیقی جینا یہ ہے کہ آدمی اپنے رب میں جینے لگے۔ وہ اس سہارے کو پکڑ لے جس کے سوا اس کائنات میں کسی کے لئے کوئی سہارا نہیں۔ وہ اللہ کی یاد کو لے کر سوئے اور اللہ کی یاد کے ساتھ صبح کرے۔ وہ اسی کے بھروسہ پر رُکے اور اسی کے بھروسہ پر چلے۔ وہ اسی کے لئے بولے اور اسی کے لئے خاموشی اختیار کرے۔

ایمان کی مثال بجلی کی کرنٹ کی سی ہے۔ پاور ہاؤس سے، بجلی کی کرنٹ جب کارخانہ میں پہنچتی ہے تو سارا کارخانہ جگمگا اٹھتا ہے۔ اس کی تمام کلیں حرکت میں آجاتی ہیں۔ اسی طرح جب کسی بندے کا اپنے رب سے ایمانی تعلق قائم ہوتا ہے تو اس کے اندر اچانک ایک نئی روشنی آجاتی ہے۔ اس کی فطرت جاگ اٹھتی ہے۔ ایمان اس کے قلب کو گرمانے والا اور اس کی روح کو تڑپانے والا بن جاتا ہے۔ وہ اس کے اندر ایک نئی آگ لگا دیتا ہے۔ وہ انسان جو پہلی بار اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا، وہ دوبارہ ایمان کی کوکھ سے ایک نیا جنم لیتا ہے۔ وہ اب خدا سے الگ نہیں رہتا بلکہ خدا میں شامل ہو جاتا ہے۔

ایک شخص کو کسی سے محبت ہو تو جسمانی طور پر وہ اس سے جدا رہتے ہوئے بھی حیاتی طور پر وہ اس سے مل جاتا ہے۔ وہ ہر چیز میں اسی کا جلوہ دیکھنے لگتا ہے۔ یہی حال اللہ پر ایمان لانے والے کا ہوتا ہے۔ وہ آسمان کی وسعتوں میں خدا کی عظمت کا مشاہدہ کرتا ہے۔ طوفانوں کی قہرمانی میں اس کو خدا کا جلال دکھائی دیتا ہے۔ چڑیوں کے چہچہے میں اس کو خدا کے نغمے سنائی دیتے ہیں۔ سورج نکلتا ہے تو اس کو محسوس ہوتا ہے کہ خدا نے اپنا نورانی ہاتھ اس کی طرف بڑھایا ہے۔ وہ درختوں کو دیکھتا ہے تو اس کو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا خدا کی تخلیقی کہانی سرسبز صفحات کی صورت میں زمین کے اوپر پھیلا دی گئی ہے۔ ہوا کا جھونکا جب اس کو چھوتا ہے تو وہ اس کے لئے خدا سے اتصال کے ہم معنی بن جاتا ہے۔ غرض جو شخص خدا کا مومن بن جائے وہ ہر آن خدا کے اتھاہ سمندر میں غوطہ لگاتا رہتا ہے۔ ہر تجربہ جو اس کے ساتھ گزرتا ہے وہ اس کو خدا سے ملانے والا بن جاتا ہے۔ وہ خدا کا ہو جاتا ہے اور خدا اس کا۔

اللہ پر ایمان ایک ایسے خدا پر ایمان ہے جو ساری کائنات کا خالق، مالک اور پروردگار ہے۔ اسی نے سب کچھ بنایا ہے، اسی کے سہارے ہر چیز قائم ہے، اس کے بغیر کسی چیز کا کوئی وجود نہیں۔ ایمان آدمی کے اندر اس شعور کو زندہ کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس حیثیت سے دیکھنے لگتا ہے کہ وہ ایک خدا کا بندہ ہے، ہر چیز میں اس کو خدا کا کرشمہ نظر آتا ہے اور ہر عطیہ اس کو خدا کے ہاتھ سے ملتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ خدا کا ذکر اور اس کی حمد ہر آن اس کے اندر سے ابلتی رہتی ہے۔ ایسے آدمی کے لمحات غفلت کے لمحات نہیں ہوتے بلکہ ہوش مندی کے لمحات ہوتے ہیں۔ ہر موقع اس کے لئے خدا کی یاد دلانے والا بن جاتا ہے۔

دن بھر کا تھکا ہوا شام کو وہ اپنے بستر پر لیٹتا ہے، اس کو گہری نیند آجاتی ہے۔ صبح کو وہ تازہ دم ہو کر اٹھتا ہے تو بے حساب احسان مندی کے جذبہ کے تحت اس کی زبان سے نکلتا ہے: خدایا تیرا یہ احسان بھی کیسا عجیب ہے۔ اگر آدمی پر نیند نہ آئے تو وہ پاگل ہو جائے اور چند دن کی زندگی بھی اس کے لئے محال ہو جائے۔ رات کی تاریکی کے بعد جب سورج نکلتا ہے اور دنیا کو روشن کر دیتا ہے تو اس کا دل بے اختیار پکار اٹھتا ہے: کیسی با برکت ہے وہ ذات جس نے روشنی پیدا کی۔ اگر روشنی نہ ہو تو سارا عالم تاریکی کا مہیب سمندر بن جائے۔ جب اس کو بھوک لگتی ہے، وہ پانی پیتا ہے اور کھانا کھاتا ہے تو اس کی پوری ہستی شکر کی کیفیت سے بھر جاتی ہے۔ وہ حیران ہو کر سوچنے لگتا ہے کہ خدا اگر آدمی کے لئے کھانا اور پانی نہ اتارتا تو آدمی کا کیا حال ہوتا۔ اس کو چوٹ لگتی ہے تو وہ خدا کو مدد کے لئے پکارتا ہے۔ اس کو حاجتیں پیش آتی ہیں تو وہ خدا ہی سے امید کرتا ہے کہ وہ اس کی حاجتوں کو پورا فرمائے گا۔ اس کو نفع ملتا ہے تو اس کو انسان کے اوپر خدا کی نوازشیں یاد آتی ہیں اور اس کا دل شکر کے جذبات سے بھر جاتا ہے۔ اس کو نقصان پہنچتا ہے تو اس کو وہ خدا کی قدرت کا ایک کرشمہ سمجھتا ہے۔ نعمتوں کا ملنا اس کو مغرور نہیں بناتا اور نقصان اس کے اندر بے صبری پیدا نہیں کرتا۔ کوئی عقیدت اس کے لئے خدا کی حریف نہیں بنتی۔ کوئی مصلحت اس کو خدا سے بے پروا نہیں کرتی۔

ایک شخص زمین اور دوسرے اجرام کی قوت کشش کو دریافت کرے یا کائناتی شعاعوں کو اپنے آلات کی مدد سے پالے تو یہ اس کے لئے محض ایک علمی یافت ہوگی۔ یہ پانے والے سے کسی ذمہ داری کا تقاضا نہیں کرے گی۔ مگر خدا کو پانے کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ خدا کو پانا ایک ایسی ہستی کو پانا ہے جو سننے والا اور جاننے والا ہے۔ جو حکمت اور

جب آدمی اس یقین تک پہنچتا ہے تو وہ خدا کی ہیبت سے کانپ اٹھتا ہے۔ وہ پکار اٹھتا ہے: "خدایا مجھے اس دن رسوا ہونے سے بچا جب تو اپنی طاقتوں کے ساتھ ظاہر ہوگا۔ جب انصاف کا ترازو قائم کیا جائے گا۔ جب آدمی بالکل بے بس حالت میں تیرے سامنے کھڑا ہوگا۔ جب تیرے سوا کسی کے پاس کوئی اختیار نہ ہوگا۔"

خدا کو الٰہ بنانے ہی کا ایک پہلو رسول کی رسالت کو ماننا ہے۔ جب آدمی خدا کو ایک زندہ اور باشعور ہستی کی حیثیت سے پاتا ہے تو فوراً یہ سوال اس کے سامنے آجاتا ہے کہ میرا خدا مجھ سے کیا چاہتا ہے۔ اس سلسلے میں اس کو اندرونی فطرت سے اشارے ملتے ہیں۔ کائنات اپنی خاموش زبان میں کچھ پیغامات نشر کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ مگر وہ چاہتا ہے کہ اپنے رب کے پیغام کو یقینی زبان میں پالے، وہ آنے والے دن سے پہلے اس دن کے معاملات سے باخبر ہو جائے۔ عین اس وقت اس کو پیغمبر کی آواز سنائی دیتی ہے: "میں اللہ کا بندہ اور رسول ہوں۔ اللہ نے مجھ کو انسانوں کی ہدایت کے لئے بھیجا ہے۔ میری طرف آؤ اور مجھ سے اپنے رب کے پیغامات معلوم کرو۔"

جو انسان حقیقۃً طالب ہو، جو فی الواقع سچائی کی تلاش میں ہو، اس کے لئے اس آواز کو پہچاننا مشکل نہیں ہوتا۔ وہ تعصب اور غفلت کے ان تمام پردوں کو پہلے ہی پھاڑ چکا ہوتا ہے جو آدمی کو گھیرے رہتے ہیں اور سچائی کی آواز کو اس کے اندر داخل نہیں ہونے دیتے۔ ایک بچہ جس طرح اپنی ماں کی آواز کو پہچان لیتا ہے، اسی طرح وہ اس خدائی پیغام کو پہچان لیتا ہے جو پیغمبر کی معرفت اس کے رب کی طرف سے اس کو پہنچ رہی ہے۔ پیغمبر کی آواز اس کے لئے ایسی ہی ثابت ہوتی ہے جیسے

طاقت کا خزانہ ہے۔ ایسے خدا کو جب ایک شخص پا تا ہے تو ٹھیک اسی وقت وہ اس حقیقت کو بھی پالیتا ہے کہ خدا نے اس کو اور کائنات کو عبث نہیں بنایا ہے۔ ایک عظیم الشان کائنات یوں ہی خاموش کھڑی رہے اور اس کی معنویت کبھی ظاہر نہ ہو، یہ ایک ایسی کائنات میں بالکل ناممکن ہے جس کا بنانے اور چلانے والا ایک علیم اور عزیز خدا ہو۔ اس طرح اس کی ایمانی یافت اس کو اس یقین تک پہنچاتی ہے کہ ضرور ہے کہ ایک دن ایسا آئے جب کہ وہ خدا لوگوں کے سامنے ظاہر ہو جائے جو کائنات کے تمام واقعات کے پیچھے کام کر رہا ہے، جب آدمی ان حقائق کو دیکھ کر جان لے جن کی بابت آج وہ نظر نہ آنے کی وجہ سے جھگڑ رہا ہے۔

پھر یہی یقین اس کو یہ بھی بتاتا ہے کہ کائنات کے خالق و مالک کا ظہور اس قسم کا غیر متعلق ظہور نہیں ہوگا جیسے تاریک رات کے بعد روشن سورج نکلتا ہے۔ یہ ایک باشعور اور محاسب و مجازی طاقت کا ظہور ہوگا۔ خداوند کائنات کا ظہور کائنات کے لئے قیامت کے ہم معنیٰ بن جائے گا۔ خدا کے ظاہر ہوتے ہی اس کے تمام سرکش اور خود پرست بندے خدا کی اس دنیا میں بے قیمت ہو جائیں گے۔ وہ اس دن مکھی مچھر سے بھی زیادہ حقیر نظر آئیں گے۔ دوسری طرف اس کے خدا پرست اور وفادار بندے اچانک سرفرازی کا مقام حاصل کر لیں گے۔ خدا کا غیب میں ہونا خدا کے غیر وفادار بندوں کو اچھل کود کے مواقع دئے ہوئے ہے۔ خدا کا ظاہر ہونا خدا کے وفادار بندوں کے لئے سرفرازی کا دن بن جائے گا۔ اس کے بعد ایک نئی، زیادہ بہتر اور مکمل دنیا شروع ہوگی جہاں سرکش لوگ ابدی طور پر جہنم میں ڈال دئے جائیں گے اور وفادار لوگ ابدی طور پر جنت میں خوشیوں اور لذتوں کی زندگی گزاریں گے۔

پٹرول کی آگ یا سوکھی زمین میں بارش۔ اس کا پورا اندرونی وجود ربانی روشنی سے بھڑک اٹھتا ہے۔ اس کی تلاش کی سوکھی زمین حق کی بارش کے ایک ایک قطرہ کو جذب کرتی چلی جاتی ہے۔ وہ خدا کو پانے کے ساتھ اس کے پیغمبر کو پالیتا ہے، اور پیغمبر کو پانے کے ساتھ اپنے خدا کو۔

رسول کوئی فرشتہ یا کوئی غیر انسانی وجود نہیں۔ وہ بھی ایک انسان ہے اور سارے انسانوں کی طرح ایک ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کی خصوصیت صرف یہ ہے کہ خدا نے اس کو اپنی پیغام رسانی کے لئے چن لیا۔ خدا نے دیکھا کہ وہ ایک ایسا انسان ہے جس کی فطرت پوری طرح زندہ ہے۔ جس کے قول وعمل میں تضاد نہیں۔ جس نے نبوت سے پہلے چالیس سال کی عمر تک کبھی ایک بار بھی امانت کی ادائگی میں کوتاہی نہیں کی۔ وہ سچا ہے، وعدہ پورا کرنے والا ہے، وہ اپنے سینہ میں انسانیت کا درد رکھتا ہے، وہ حق کے لئے اس سے زیادہ بے چین ہوتا ہے جتنا کوئی شخص اپنے ذاتی منافع کے لئے بے چین ہوتا ہے۔

خدا نے محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں وہ خالص روح پائی جو حق کی امانت کا امین بن سکے۔ اس نے اس کے اندر وہ غیر مصلحت پرستانہ کردار پایا جو کسی ادنیٰ لچک کے بغیر ربانی ذمہ داری کو ادا کر سکے۔ اس نے اس عربی انسان میں وہ طلب دیکھی جو اس بات کی ضمانت تھی کہ وہ خدا کی الہامی امانت کی پوری قدردانی کرے گا۔ اور اس کو اسی طرح لے گا جس طرح اس کو لینا چاہئے۔ ان پہلوؤں میں یہ عربی انسان چالیس برس کی زندگی تک انتہائی مکمل ثابت ہوا۔ اس لئے خدا نے اس کو اپنے آخری اور عالمی پیغمبر کی حیثیت سے چن لیا اور اس انسان کامل نے اپنی نبوت کی ۲۳ سال کی

زندگی سے ثابت کر دیا کہ خدا کا یہ انتخاب انتہائی درست تھا۔ اس انسان کامل نے پیغمبری کی ذمہ داری کو اتنی معیاری صورت میں انجام دیا کہ اس سے زیادہ معیاری صورت میں اس کی انجام دہی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

پیغمبر کے ذریعہ ہم کو خدا کی وہ محفوظ کتاب ملی ہے جو اس کے اوپر فرشتہ کے ذریعہ اتاری گئی۔ اس کتاب میں وہ تمام چیزیں لکھی ہوئی صورت میں موجود ہیں جو اللہ کو ہم سے مطلوب ہیں۔ قرآن میں اللہ ہم سے انسانی زبان میں ہم کلام ہوتا ہے۔ پیغمبر نے اور آپ کے ساتھیوں نے ہر قسم کا بہترین اہتمام کر کے اس کو اس کی اصلی شکل میں محفوظ رکھا۔ اور ہم کو پوری طرح پہنچا دیا۔ پیغمبر نہ صرف خدائی الہام کو وصول کرنے والا تھا بلکہ اس نے کامل اور مکمل صورت میں اس کو اپنی زندگی میں اختیار کیا۔ اس طرح پیغمبر کی زندگی اس ربانی ہدایت کا عملی نمونہ بن گئی جو قرآن میں لفظوں کی صورت میں ظاہر کی گئی تھی۔

پیغمبر نے گھریلو زندگی بنائی۔ وہ بستی اور بازاروں میں لوگوں کے درمیان رہا۔ اس نے دوستوں اور دشمنوں سے معاملہ کیا۔ اس کو فتح و شکست کے مواقع پیش آئے۔ اس نے دعوت دی اور دعوتی مراحل سے گزرا۔ اس کو بھوک لگی اور اس نے چوٹ کھائی۔ اس نے مفلسی اور دولت مندی کے دن دیکھے۔ غرض ایک عام آدمی سے لے کر ایک جج اور بادشاہ تک انسانی زندگی کے جتنے مختلف تجربات ہیں، سب اس پر گزرے۔ ہر جگہ اس نے ایک ربانی انسان کا رویہ اختیار کیا۔ اس طرح اس کی زندگی قیامت تک تمام انسانوں کے لئے مکمل نمونہ بن گئی۔ ہر وہ آدمی جو اپنے رب کے یہاں اس حال میں پہنچنا چاہتا ہے کہ اس کا رب اس سے راضی ہو اور اس کو ابدی باغوں والے گھر میں داخل کرے، اس کے لئے ایک ہی راہ ہے۔ وہ قرآن سے اللہ کا حکم معلوم

کرے اور پیغمبر کی زندگی میں اس حکم کا عملی نمونہ دیکھے۔ اور ان دونوں چیزوں کی روشنی میں اپنی زندگی گزارنے لگے۔ اس کے سوا جتنی صورتیں ہیں، سب بھٹکنے کی صورتیں ہیں، نجات کی صورت اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ پیغمبر کی زندگی ایک ایسی مکمل زندگی ہے جس میں چھوٹے لوگوں کے لئے بھی نمونہ ہے اور بڑے لوگوں کے لئے بھی۔

نماز

اسلام کا دوسرا رکن نماز ہے۔ نماز اپنی متعین شکل کے اعتبار سے یہ ہے کہ روزانہ دن رات کے درمیان پانچ وقت مقررہ انداز میں اللہ کی عبادت کی جائے۔ یہ انداز جو رسول کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں سکھایا ہے، اتنا جامع ہے کہ اس سے زیادہ بہتر عبادتی انداز کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ جب وقت آتا ہے تو اذان کے ذریعہ اللہ کی بڑائی کا اعلان کیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ نماز کا وقت آگیا، اپنی فلاح کے لئے جمع ہو جاؤ۔ لوگ وضو کرکے اپنے پاکی کے احساس کو تازہ کرتے ہیں۔ پھر اللہ کو یاد کرتے ہوئے مسجد میں پہنچتے ہیں۔ وہاں سب مل کر نماز ادا کرتے ہیں۔ نماز کا ایک امام ہوتا ہے جس کی رہنمائی میں اجتماعی نماز ادا کی جاتی ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ اسی طرح سارے مسلمان خدا کے رسول کو اپنا مرکز اجتماع قرار دے کر اس کے گرد متحد زندگی گزاریں گے۔ رکوع و سجود اور قیام و قعود کی مختلف حالتوں کے ذریعہ خدا کے سامنے اپنی بندگی کا اقرار کیا جاتا ہے۔ کبھی دست بستہ کھڑے ہوکر، کبھی جھک کر، کبھی نیازمندانہ بیٹھ کر، کبھی اپنے سر کو زمین پر رکھ کر خدا کے ساتھ اپنے عہد بندگی کو تازہ کرتے ہیں۔ نماز میں قرآن کے حصے پڑھے جاتے ہیں۔ قرآن کی ایک عجیب خصوصیت یہ ہے کہ اس کو جہاں کہیں سے اور جتنا بھی پڑھئے، قرآن کی دعوت کا تعارف مل جاتا ہے۔

قرآن کا ہر صفحہ گویا قرآن کا خلاصہ ہے۔ اس طرح نماز میں اگرچہ بیک وقت قرآن کا مختصر حصہ پڑھا جاتا ہے مگر وہ اللہ کی پسند و ناپسند کو جاننے کے لئے ہمیشہ کافی ہوتا ہے۔

اسی کے ساتھ نماز میں خدا کی حمد اور ذکر کے کلمات بولے جاتے ہیں، اس سے دعا کی جاتی ہے، رسول کے لئے اور تمام اہل ایمان کے لئے نیک جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کا خاتمہ تمام انسانوں کو سلامتی بھیج کر کیا جاتا ہے۔ اس طرح اپنے مختلف اجزاء کے ذریعہ نماز ایک ایسا عمل بن جاتی ہے جو بیک وقت اللہ کی عبادت بھی ہے اور اللہ کے حکموں کی یاددہانی بھی۔ وہ اہل ایمان کے لئے دینی غذا بھی ہے اور ان کے درمیان اتحاد و اجتماعیت کا ذریعہ بھی۔ وہ اسلامی زندگی کا نشان بھی ہے اور نظم وضبط کی تربیت بھی۔ وہ اللہ سے روحانی اتصال کا مقام بھی ہے اور روزمرہ کی زندگی میں حرکت وعمل کا سبق بھی۔

نماز اپنی شکل کے اعتبار سے مخصوص عبادت کا نام ہے اور اپنی حقیقت کے اعتبار سے تواضع اور توجہ الی اللہ کا۔ اپنے مقابلہ میں کسی کی عظمت تسلیم کرنے کے لئے آدمی زبان سے جو آخری کلمہ بول سکتا ہے وہ یہ کہ وہ کہے " وہ سب سے بڑا ہے"۔ نماز میں بار بار یہ کلمہ (اللہ اکبر) خدا کے لئے بولا جاتا ہے اور اس طرح اپنے مقابلہ میں خدا کی مطلق کبریائی کا لسانی اقرار کیا جاتا ہے۔ جسمانی طور پر کسی کی بڑائی کے اعتراف کی آخری صورت سجدہ ہے۔ سجدہ سے بڑھ کر کوئی صورت نہیں ہوسکتی جس سے آدمی دوسرے کی عظمت کا جسمانی اعتراف کرے۔ نماز میں بار بار خدا کے آگے سجدہ کرکے خدا کی بے مثال عظمتوں کا عملی اعتراف کیا جاتا ہے۔ کسی کو اپنی زندگی کا مرکز ومحور بنانے کی سب سے زیادہ کامیاب ہیئت جو تصور کی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ آدمی اپنے چہرے کا رخ پوری طرح

اس کی طرف کر دے۔ نماز میں بیت اللہ کی طرف رخ کا اہتمام کرکے ظاہر کیا جاتا ہے کہ بندے نے اپنی زندگی کو خدا کی طرف موڑ دیا، اس نے اپنی زندگی کو اندر سے لے کر باہر تک خدا رخی (God-oriented) بنانے کا فیصلہ کر لیا۔

اللہ کے آگے بندے کے اس جھکاؤ سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ صرف خدا کے سامنے جھکاؤ تک نہیں رہتی، وہ اس کی مستقل کیفیت بن جاتی ہے۔ جو آدمی اللہ سے ڈرنے لگے، جو اللہ کے آگے جھک جائے۔ جو اللہ کے مقابلہ میں اپنے کو بے حقیقت بنالے وہ بندوں کے سامنے آئے گا تو ناممکن ہے کہ یہاں اس کے رویہ میں اس کے عبادتی اثرات ظاہر نہ ہوں۔

وہ انسان کے آگے سجدہ میں نہیں گرے گا مگر وہ انسان کے مقابلہ میں گھمنڈ بھی نہیں دکھائے گا۔ وہ انسان کو "تو بڑا ہے" نہیں کہے گا مگر اپنی بڑائی کا سکہ اس پر قائم کرنے کی کوشش بھی نہیں کرے گا۔ نماز میں اس کا ساجد بننا بندوں کے مقابلہ میں تواضع کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ نماز میں اس کا خدا کی تابعداری کا اقرار کرنا بندوں کے معاملات میں حقوق کی ادائگی کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ نماز میں اس کی رخ بندی بندوں کے معاملات میں اصول کی پابندی کی صورت میں ظاہر ہوگی۔ وہ انسان جو خدا کے سامنے کامل بندگی کا اقرار کرکے مسجد سے نکلا تھا، وہ بندوں کے درمیان کامل اخلاق کا نمونہ بنا ہوا دکھائی دے گا ——— نماز کسی بندے کے معاملات کو خدا کے ساتھ عجز کی بنیاد پر قائم کرتی ہے اور بندوں کے ساتھ اس کے معاملات کو تواضع کی بنیاد پر۔

روزانہ پانچ وقت کی نمازوں کے علاوہ نماز کی اور بھی کئی صورتیں ہیں۔

رات کو تہجد کی نماز، کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آنے کے وقت کی نماز، حاجت اور استخارہ کی نماز، اسی طرح جمعہ اور عیدین کی جماعت، جنازہ کی نماز جماعت، وغیرہ۔ یہ نمازیں اسی کیفیت کو مزید اضافہ کے ساتھ حاصل کرنے کی کوششیں ہیں جو پنج وقتہ نمازوں سے ہر روز مطلوب ہوتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نماز اگر پوری طرح کسی کو مل جائے تو وہ اس کی پوری زندگی میں شامل ہو جاتی ہے۔ وہ ایک نیا کام شروع کرے تو دو رکعت نماز پڑھ کر خدا سے مدد کی درخواست کرتا ہے۔ وہ کسی مقام پر پہلی بار جائے تو وہاں وہ نماز پڑھ کر اپنے رب کی یاد کرتا ہے۔ کوئی مسئلہ اس کی سمجھ میں نہ آرہا ہو تو نماز پڑھ کر اپنے دل کی گرہ کو کھولنے کی کوشش کرتا ہے۔

یہی حال بندوں سے تعلقات کے معاملہ میں بھی ہوتا ہے۔ بندوں سے معاملہ کرتے ہوئے اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا نماز اس کے ساتھ ایک خدائی نگراں کی طرح لگی ہوئی ہے۔ دنیا کی پھیلی ہوئی زندگی میں اپنا حصہ ادا کرتے ہوئے اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ساری زمین خدا کی مسجد ہے اور ہر جگہ اس کو اپنی عبادت گزاری کے تقاضے پورے کرنے ہیں۔

روزہ

اسلام کا تیسرا رکن روزہ ہے۔ روزہ میں آدمی صبح کو فجر سے لے کر شام کو سورج ڈوبنے تک نہ کوئی کھانے کی چیز کھاتا اور نہ پینے کی چیز پیتا۔ اس طرح اپنی زندگی کی سب سے بڑی ضرورت کو چھوڑ کر وہ صبر (رکنے اور برداشت کرنے) کی تربیت حاصل کرتا ہے۔ کھانا پینا چھوڑنے کی وجہ سے اس کو دن میں بھوک لگتی ہے۔ پیاس ستاتی ہے،

اس کا جسم کمزور ہو جاتا ہے۔ اس کے معمولات درہم برہم ہو جاتے ہیں۔ اس کی پوری زندگی کا نظام تلپٹ ہوجاتا ہے۔ مگر وہ ان تمام چیزوں کو برداشت کرتا ہے۔

وہ ناخوشگواریوں کو جھیلتا ہے۔ وہ اپنی جسمانی تکلیفوں پر قابو رکھتے ہوئے اپنے ہوش و حواس کو برقرار رکھتا ہے۔ وہ مشکلات کے باوجود اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں لگا رہتا ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے پانی ہوتا ہے مگر پیاس کے باوجود وہ اس کو نہیں پیتا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے کھانا ہوتا ہے مگر بھوک کے باوجود وہ اس کو نہیں کھاتا۔ اس طرح وہ اپنے آپ کو اس کے لئے تیار کرتا ہے کہ وہ ایک پابند اور ذمہ دار زندگی گزارے۔ وہ وہی کرے جو اس کو کرنا چاہئے۔ اور وہ نہ کرے جو اس کو نہیں کرنا چاہئے۔ خواہ کسی بھی قسم کی شکل پیش آئے، ہر حال میں وہ اصل مقصد حیات کی طرف اپنے سفر کو جاری رکھے۔

خدا نے دنیا کی زندگی میں بے شمار نعمتیں انسان کو دے رکھی ہیں۔ مگر یہ نعمتیں خود بخود ملتی رہتی ہیں، اس لئے آدمی کو ان کا احساس نہیں ہوتا۔ آدمی کو ایک بے حساب قسم کا پیچیدہ جسمانی نظام دیا گیا ہے۔ ایک رگ میں فرق آ جائے تو سارے جسم کا توازن بگڑ جائے۔ دنیا میں دھوپ، ہوا، پانی، اور لاتعداد دوسری چیزیں حیرت انگیز طور پر اس کے لئے کارآمد بنا دی گئی ہیں۔ اگر ایک چیز بھی ان میں سے نہ رہے تو زندگی عذاب بن جائے۔

یہ تمام چیزیں بغیر کسی اکتسابی کوشش کے آدمی کو ملتی رہتی ہیں، اس لئے آدمی ان کی اہمیت کو سمجھ نہیں پاتا۔ روزہ میں انسان کو اس کی انتہائی بنیادی ضرورت سے عارضی طور پر کچھ دیر کے لئے روکا جاتا ہے۔ اور اس طرح اس

کے اندر خدائی نعمتوں کا شعور جگایا جاتا ہے۔ دن بھر کی بھوک، پیاس، تھکن اور بے آرامی کے بعد شام کو جب آدمی کھانا کھاتا ہے اور پانی پیتا ہے تو اس کو اپنی محتاجی اور خدا کی بے پناہ بخششوں کا احساس ہوتا ہے، وہ اللہ کے شکر کے جذبہ سے بھر جاتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ جس خدا نے ایسی نعمتیں دی ہیں، اس کے لئے اگر میں اپنی پوری زندگی بھی قربان کر دوں تو حق ادا نہیں ہو سکتا۔

دنیا میں مومن کو جو زندگی گزارنی ہے وہ شروع سے آخر تک صبر کی زندگی ہے۔ اس کو اللہ کی جائز کی ہوئی چیزوں تک اپنے کو محدود رکھنا ہے، اس کی ناجائز کی ہوئی چیزوں کو ہاتھ نہیں لگانا ہے۔ حق پرستانہ زندگی کی راہ میں آنے والی مشکلات کو برداشت کرنا ہے۔ دوسروں کی طرف سے پیش آنے والی تکلیفوں کا جواب دینے میں اپنا وقت ضائع نہیں کرنا ہے بلکہ ان کو سہتے ہوئے اپنے فریضۂ حیات کو پورا کرنے میں لگے رہنا ہے۔ اس کو دنیا کے نقصانات کی پروانہ کرتے ہوئے آخرت کی طرف اپنے سفر کو جاری رکھنا ہے۔

ایسے تمام مواقع پر جب کہ اس کے نفس کو چوٹ لگے، جب اس کے اندر کوئی ناپسندیدہ بات پیش آنے کی وجہ سے اشتعال پیدا ہو تو اس کو منفی ردعمل سے اپنے آپ کو بچانا ہے۔ اور ہر حال میں اپنے آپ کو مثبت مقاصد کے لئے وقف رکھنا ہے یہ تمام چیزیں بے پناہ صبر و برداشت چاہتی ہیں۔ صبر کے بغیر کوئی شخص اسلام کے راستہ کا مسافر نہیں بن سکتا۔ روزہ ہر سال اسی صبر کا سبق دیتا ہے۔ وہ ایک مہینہ تک صابرانہ زندگی کی مشق کرا کر آدمی کو تیار کرتا ہے کہ وہ سال کے بقیہ مہینوں کو صبر کے ساتھ گزار سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ مومن کی پوری زندگی ایک قسم کی روزہ دار زندگی ہے۔اس کو تمام عمر برائی سے ،منفی تدبیروں سے ،بے صبری کے اقدامات سے، دوسروں کو ستانے سے، اللہ کے حرام کو حلال کرنے سے روزہ رکھ لینا ہے۔سال کے ایک مہینہ میں ضروریات زندگی پر پابندی لگاکر اسی قسم کی "روزہ دار" زندگی کی مشق کرائی جاتی ہے۔ روزہ اپنی شکل کے اعتبار سے مقررہ اوقات کے لئے کھانا پانی چھوڑنا ہے اور اپنی حقیقت کے اعتبار سے صابرانہ زندگی کی تربیت۔

زکوٰۃ

اسلام کا چوتھا رکن زکوٰۃ ہے۔ زکوٰۃ کا مطلب یہ ہے کہ اپنی کمائی اور اپنی دولت سے ہر سال ایک مقررہ رقم (عام طور پر ڈھائی فی صد) اللہ کے نام پر نکالی جائے۔اور اس کو دین کی ضرورتوں اور حاجت مندوں کے اوپر خرچ کیا جائے۔ یہ زکوٰۃ ایک قسم کی سالانہ یاددہانی ہے کہ انسان کے پاس جو کچھ ہے وہ خدا کا ہے، اس کو چاہئے کہ اپنی کسی چیز کو خدا سے بچاکر نہ رکھے۔

دنیا میں آدمی جو کچھ حاصل کرتا ہے، اس کا اپنا حصہ اس میں بہت تھوڑا ہوتا ہے۔ زمین وآسمان کے اندر جو بے شمار اعلیٰ ترین انتظامات ہیں اگر وہ ساتھ نہ دیں تو آدمی نہ کوئی دانہ اگا سکے، نہ مویشیوں کی پرورش کرسکے، نہ صنعتیں قائم ہوسکیں، نہ اور کوئی کام کرنا ممکن ہو۔ انسان کے اپنے وجود سے لے کر باہر کے عالم تک جو خدائی انتظامات ہیں، ان میں سے کوئی ایک چیز بھی اگر خدا واپس لے لے تو آدمی کی ساری کوششیں اور منصوبے اکارت چلے جائیں اور کوئی نتیجہ پیدا نہ کریں۔

زکوٰۃ اسی حقیقتِ واقعہ کا مالی اعتراف ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ آدمی اپنے مال کو خدا کا مال سمجھے۔ وہ اپنی کمائی میں خدا کا حق تسلیم کرے۔ اس معاملہ میں زیادہ کی کوئی حد نہیں ہے۔ تاہم کم سے کم کی حد مقرر کر دی گئی ہے۔ قانونی زکوٰۃ کی صورت میں آدمی ہر سال خدا کا وہ حق نکالتا ہے جو کم سے کم اسے خدا کے نام پر دینا چاہئے۔ اور پھر اس کو جمع کر کے خدا کی مقرر کی ہوئی مدوں میں خرچ کیا جاتا ہے۔

اس نکالنے میں آدمی کو نہ تو یہ اجازت ہے کہ وہ اس کو دوسروں کے اوپر احسان سمجھے اور نہ اس کو ایسا کرنا چاہئے کہ پانے والوں کو ذلیل کرے۔ اس کو اس جذبہ کے تحت دینا چاہئے کہ یہ خدا کی طرف سے آیا ہوا دوسروں کا حصہ ہے اور وہ اس کو حق داروں کی طرف لوٹا رہا ہے۔ وہ اس لئے دوسروں کو کھلائے تاکہ خدا آخرت کے دن اس کو کھلائے، وہ اس لئے دے تاکہ خدا آخرت کے دن اس کو محروم نہ کرے۔

زکوٰۃ ان ذمہ داریوں کی ایک علامت ہے جو ایک انسان کو دوسرے انسانوں کے درمیان ادا کرنا ہے۔ وہ ذمہ داری یہ ہے کہ ہر آدمی دوسرے آدمی کا حق پہچانے، ہر آدمی دوسرے آدمی کے لئے دردمند ہو۔ یہ جذبات یہاں تک ترقی کریں کہ آدمی خود اپنی چیزوں تک میں دوسرے کا حصہ سمجھنے لگے۔ دوسرے سے کوئی معاوضہ نہ ملتے ہوئے بھی وہ اس کے کام آئے۔ دوسرے سے نفع کی امید نہ ہوتے ہوئے بھی وہ اس کی عزت کا نگہبان ہو۔ دوسرے سے رشتہ اور دوستی کا تعلق نہ ہوتے ہوئے بھی وہ اس کا خیر خواہ ہو۔ زکوٰۃ ایک طرف آدمی کو یہ سبق دیتی ہے کہ اس کی ہر چیز خدا کا عطیہ ہے۔ دوسری طرف اس کو یہ احساس

دلاتی ہے کہ تم اگر خدا کے بندے ہو تو تم کو معاشرہ کے اندر بے درد اور خود غرض بن کر نہیں رہنا چاہئے۔ بلکہ تمہاری زندگی میں دوسروں کا بھی حصہ ہونا چاہئے۔

سماجی تنظیم کی ایک صورت یہ ہے کہ آدمی دوسرے کے کام صرف اس وقت آئے جب کہ اس کو دوسرے سے نفع کی امید ہو۔ وہ کسی کو قرض دے تو اس اعتماد پر دے کہ وہ سود کے ساتھ اس کی طرف اضافہ شدہ حالت میں لوٹے گا۔ ایسے معاشرہ میں استحصال کا مزاج فروغ پاتا ہے۔ ہر آدمی دوسرے آدمی کو دبانا اور لوٹنا چاہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پورا سماج بدنظمی کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایسے سماج میں کسی کو بھی سکون حاصل نہیں رہتا۔ خواہ وہ امیر ہو یا غریب۔

سماجی تنظیم کی دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی خدا سے بدلہ پانے کی امید پر دوسرے انسان کے کام آئے۔ وہ اس خدائی یقین دہانی کی بنیاد پر دوسرے کو دے کہ خدا اس کو آخرت میں بہت زیادہ بڑھا کر لوٹائے گا۔ ایسے معاشرہ میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت اور بے تعلقی کے جذبات فروغ نہیں پاتے۔ لوگ ایک دوسرے کو استحصال کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ سماج میں باہمی ناراضی اور انتشار کی فضا پیدا نہیں ہوتی۔ ہر ایک دوسرے کی طرف سے امن میں رہتا ہے۔ اور پورا سماج سکون اور خوش حالی کا سماج بن جاتا ہے۔ زکوٰۃ ظاہری اعتبار سے ایک قسم کا سالانہ "ٹیکس" ہے اور حقیقت کے اعتبار سے اپنی ملکیت میں خدا اور بندے کے حق کا اعتراف۔

حج

اسلام کا پانچواں رکن حج ہے۔ سال میں ایک بار ساری دنیا کے مسلمان مرکز

اسلام میں جمع ہوتے ہیں اور وہاں مخصوص اجتماعی عبادات انجام دیتے ہیں۔ حج کی عبادات کیا ہیں۔ یہ دراصل ان اسلامی تعلیمات کو علامتی طور پر دہرانا ہے جو اسلام میں معنوی طور پر مطلوب ہیں۔ یہ اسلام کے احکام کو مخصوص صورتوں میں تشکل کر کے اللہ سے یہ عملی عہد کرنا ہے کہ آدمی انھیں بنیادوں پر اپنی زندگی کو قائم کرے گا۔ اسلام کی دوسری عبادات میں بھی اگرچہ یہ پہلو موجود ہے۔ تاہم حج میں زیادہ بڑے پیمانہ پر اور مجموعی شکل میں یہ تمام چیزیں اکھٹا کر دی گئی ہیں۔

اسلام چاہتا ہے کہ انسانوں کے درمیان ہر قسم کے مصنوعی امتیازات ختم ہو جائیں اور تمام انسان ایک خدا کے بندے بن کر دنیا میں زندگی گزاریں، احرام باندھنا اسی کی ایک عملی صورت ہے جس میں مختلف قوموں اور مختلف ملکوں کے لوگ یکساں طور پر ایک ہی سادہ لباس پہنے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اسلام چاہتا ہے کہ آدمی کی زندگی خدا کے گرد گھومنے لگے، کعبہ کے گرد گھومنا اسی کا ایک علامتی مظاہرہ ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ خدا کے بندے خدا کی راہ میں دوڑ دھوپ کرنے والے بنیں، صفا و مروہ کے درمیان دوڑ (سعی) اسی کی ایک مشق ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ جب خدا کی پکار بلند ہو تو اس کے بندے اس کی پکار پر دوڑ پڑیں، حج کے دوران بار بار لبیک اللّٰھم لبیک (حاضر ہوں خدایا میں حاضر ہوں) کہنا اسی کا ایک عملی اقرار ہے اسلام چاہتا ہے کہ آدمی اس دن کو یاد کرے جب کہ سارے انسان خدا کے یہاں جمع کئے جائیں گے، عرفات کے وسیع کھلے ہوئے میدان میں تمام حاجیوں کا قیام اسی کی ایک ظاہری یاددہانی ہے۔

اسلام یہ چاہتا ہے کہ آدمی شیطان سے بیزار ہو۔ اور ہمیشہ اس کو اپنے سے دور

بھگا نا رہے، رمی جمار کے موقع پر شیطان کی پتھر کی علامتوں پر کنکریاں مارنا اسی کا ایک عملی سبق ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ انسان ہر حال میں خدا کے عہد پر قائم رہے خواہ ایسا کرنا اس کے لئے جان و مال کی قربانی کی قیمت پر کیوں نہ ہو۔ منی میں جانور کو قربان کرنا اسی کی ایک خارجی علامت ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ اجتماعی زندگی میں لوگ ایک دوسرے کی طرف سے پیش آنے والی ناگواریوں کو برداشت کریں، حج کے زمانہ میں اس کی خصوصی تربیت ہوتی ہے۔ مختلف قسم کے لاکھوں لوگ بیک وقت ایک مقام پر جمع ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بار بار ایسے مواقع آتے ہیں جب کہ ایک کو دوسرے سے تکلیف پہنچے۔ حج کے دنوں میں خصوصی طور پر لازم کر دیا گیا کہ غصہ، بدکلامی، مارپیٹ، کسی جان کو تکلیف پہنچانا، بےحیائی اور بددیانتی کے کام سے مکمل پرہیز کیا جائے۔ اللہ سے بہتر سلوک پانے کے شوق میں بندوں کے ساتھ بہتر سلوک کیا جائے۔

حج خدارخی زندگی گزارنے کا سبق ہے۔ وہ آخرت کے ہولناک دن کو یاد دلاتا ہے۔ وہ خدا کے لئے سرگرم ہونے کا ریہرسل ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ آدمی کو خدا کے راستہ میں جدوجہد کرنے والا بننا چاہئے۔ وہ انسان کو بتاتا ہے کہ تمہارا سب سے بڑا دشمن شیطان ہے اس کو کبھی اپنے قریب آنے کا موقع نہ دو۔ اس کا پیغام ہے کہ اللہ کے انعامات حاصل کرنا چاہتے ہو تو اللہ کے لئے اپنے جان و مال کو قربان کرو۔ وہ عملی حالات پیدا کرکے بتاتا ہے کہ مختلف انسانوں کو ایک دوسرے کی ناخوش گواریوں کو برداشت کرتے ہوئے انصاف اور خیر خواہی کے ساتھ مل جل کر رہنا چاہئے۔ وہ انسانی مساوات کا عظیم الشان مظاہرہ ہے۔ غرض حج ایک ایسی مکمل عبادت ہے کہ آدمی

اگر اس کو صحیح طور پر انجام دے لے تو اس کے تمام معاملات درست ہو جائیں، خواہ یہ معاملات خدا سے متعلق ہوں یا انسانوں سے متعلق۔

حج کی عبادت اگرچہ زندگی میں صرف ایک بار ادا کرنے کا حکم ہے، لیکن وہ اتنی عظیم عبادت ہے کہ اگر ایک بار بھی اس کو اس کے تمام آداب اور تقاضوں کے ساتھ پوری طرح ادا کر لیا جائے تو ہمیشہ اس کا اثر باقی رہتا ہے، ایک بار کی عبادت ساری عمر کی اصلاح کے لیے کافی ہو جاتی ہے۔
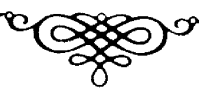
آدمی کا امتحان

آدمی کا امتحان

پہلا انسان جو خدا نے پیدا کیا وہ آدم تھے۔ اس وقت خدا کی پیدا کی ہوئی دو مخلوقات اور تھیں۔ ایک فرشتے، دوسرے جن۔ خدا نے فرشتوں اور جنوں کو حکم دیا کہ تم سب آدم کے آگے سجدہ کرو۔ فرشتے خدا کا حکم سنتے ہی سجدہ میں گر پڑے۔ مگر ابلیس، جو جنوں کا سردار تھا، اس نے سجدہ نہیں کیا۔ خدا نے کہا: تم نے سجدہ کیوں نہیں کیا جب کہ میں نے اس کا حکم دیا تھا۔ ابلیس بولا: میں آدم سے بہتر ہوں۔ تو نے آدم کو مٹی سے بنایا ہے اور مجھ کو آگ سے (اعراف ۱۲) ابلیس خدا کو سجدہ کرنے کے لئے تیار تھا۔ مگر وہ آدم کو سجدہ کرنے پر راضی نہ ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ملعون اور جہنمی قرار دے دیا گیا۔

یہی معرکہ آدم کی اولاد میں آج بھی جاری ہے۔ ایک طرف فرشتے ہیں جو آدمی کو تسلیم اور اعتراف کا سبق دے رہے ہیں۔ دوسری طرف ابلیس ہے جو انسان کی رگوں میں تیرتا ہے۔ اور آدمی کو اکساتا ہے کہ وہ خود پسندی (انا خیر منہ) کا طریقہ اختیار کرے اور اسی کا ہم مسلک بن جائے۔ اس طرح ہماری زندگی میں دوبارہ بہت بڑے پیمانہ پر وہی کہانی دہرائی جا رہی ہے جو پہلے انسان کی پیدائش کے وقت ابتداءً پیش آئی تھی۔

دنیا میں زندگی گزارتے ہوئے ہم کبھی نہ کبھی ایک "آدم" سے دوچار ہوتے ہیں۔ ہمارا سابقہ کسی نہ کسی انسان سے پڑتا ہے اور اس کا کوئی نہ کوئی حق ہمارے

اوپر عائد ہوتا ہے، خواہ وہ ایک اچھے بول کی صورت میں کیوں نہ ہو۔ایسے ہر موقع پر خدا اپنی خاموش زبان میں کہہ رہا ہوتا ہے کہ میرے حکم کی تعمیل میں اس آدم کے سامنے جھک جاؤ۔اب جو لوگ فرشتوں کی روش کو اختیار کریں اور اپنے بارے میں خدا کے حکم کو پہچان کر اپنے آپ کو اس کے آگے ڈال دیں، وہ خدا کے وفادار بندے ہیں۔ وہ ابدی جنتوں میں جگہ پائیں گے۔اور جو لوگ ابلیس کا طریقہ اختیار کریں اور اپنی بڑائی کی خاطر دوسروں کے آگے جھکنے کے لئے تیار نہ ہوں، وہ خدا کے باغی لوگ ہیں۔ وہ ابلیس کے ساتھ جہنم میں ڈال دئے جائیں گے تاکہ وہاں ابدی طور پر جلتے رہیں:

قال فبما اغویتنی لاقعدن لھم صراطک المستقیم۔ثم لاٰتینھم من بین ایدیھم ومن خلفھم وعن ایمانھم وعن شمائلھم ولا تجد اکثرھم شٰکرین قال اخرج منھا مذءوماً مدحوراً لمن تبعک منھم لاملئن جھنم منکم اجمعین	شیطان بولا: جیسا تونے مجھے بدراہ کیا ہے، میں تیری سیدھی راہ پر انسانوں کی تاک میں بیٹھوں گا۔ میں ان پر آؤں گا آگے سے اور پیچھے سے، دائیں سے اور بائیں سے۔اور تو ان میں سے اکثر کو شکرگزار نہ پائے گا۔ اللہ نے کہا: نکل یہاں سے ذلیل وخوار ہوکر۔ان میں سے جو کوئی تیری راہ چلا تو میں تم سب سے جہنم کو بھر دوں گا۔ (اعراف ۱۸-۱۶)

انسان خدا کا بندہ ہے۔اس کو اصل سجدہ خدا ہی کو کرنا ہے۔مگر دنیا کی زندگی میں وہ جن لوگوں کے درمیان رہتا ہے،ان کے مقابلہ میں بار بار اس پر کسی نہ کسی کا حق آتا ہے اور بار بار خدا کا حکم ہوتا ہے کہ یہاں تم اس "آدم" کے سامنے جھک جاؤ۔یہی آدمی کا اصل امتحان ہے۔ خدا کو سجدہ کرنے کے لئے آدمی آسانی سے تیار ہو جاتا ہے۔

مگر جہاں اس کو کسی انسان کا اعتراف کرنا ہو، جہاں کسی انسان کے سامنے جھکنے کا سوال ہو وہاں فوراً اس کے اندر ابلیس والی نفسیات جاگ اٹھتی ہیں "میں اس سے بہتر ہوں، میں کیوں اس کے سامنے جھکوں" یہ احساس شعوری یا غیر شعوری طور پر، اس کے لئے رکاوٹ بن جاتا ہے۔ وہ جس خدا کو سجدہ کر رہا ہوتا ہے، اس خدا کے حکم کے باوجود "آدم" کے آگے جھکنے سے انکار کر دیتا ہے۔

دو آدمیوں کے درمیان ایک معاملہ پڑتا ہے۔ اس معاملہ میں ایک حق پر ہوتا ہے اور دوسرا ناحق پر۔ جو شخص حق پر ہے وہ گویا دوسرے شخص کے لئے وقت کا "آدم" ہے۔ دو آدمیوں کے درمیان اس صورت حال کا پیدا ہونا ہی خدا کا یہ حکم آجانا ہے کہ میرے بنائے ہوئے اس آدم کے سامنے میری خاطر جھک جاؤ۔ اب جو شخص اپنے حریف کے حق کو مانتے ہوئے اس کے سامنے اپنے آپ کو جھکا دے، اس نے فرشتوں کی پیروی کی۔ اور جس شخص کے لئے اس کی "میں" حق کے اعتراف میں مانع ہو جائے، جو اس ذہن کے تحت حق دار کے سامنے جھکنے سے انکار کر دے کہ میری پوزیشن مضبوط ہے، یہ شخص میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتا، اس نے ابلیس کی پیروی کی۔ خدا کے سامنے سجدہ کرنا اس کی نجات کا سبب نہیں بن سکتا۔ خدا کے آگے سجدہ صرف اس شخص کا معتبر ہے جو خدا کے حکم کی تعمیل میں اس کے بنائے ہوئے "آدم" کے سامنے بھی جھکنے پر راضی ہو جائے۔

جو شخص یہ کہے کہ میں خدا کے لئے سجدہ کروں گا مگر آدم کے سامنے نہیں جھکوں گا، وہ ابلیس کا بھائی ہے۔ اس کے سجدہ کی خدا کے یہاں کوئی قیمت نہیں۔ اس نے آدم کے سامنے جھکنے سے انکار کر کے کبر کا مظاہرہ کیا ہے۔ اور جو اپنے اندر کبر کی نفسیات

کی پرورش کرے اس کا کوئی عمل خدا کبھی قبول نہیں کرتا۔

پہلے انسان (آدم) کا قصہ خدا کے سامنے براہ راست پیش آیا تھا۔ اب دنیا کی زندگی میں ہر آن یہی قصہ خدا کے غیب میں پیش آرہا ہے۔ آج خدا ہمارے سامنے عیاناً موجود نہیں ہے۔ آج جو چیز خدا کی جگہ پر ہے وہ خدا کی کتاب اور اس کے رسول کا طریقہ ہے اور اسی کے ساتھ آدمی کا اپنا ضمیر ہے جو اندر سے اس کو آواز دیتا ہے۔

ہر روز جب کسی انسان سے ہمارا سابقہ پیش آتا ہے اور یہ تقاضا ہوتا ہے کہ ہم اس کے حق کا اعتراف کریں، خواہ یہ تقاضا لفظی اعتراف کا ہو یا کسی عمل کا، اس وقت گویا خاموش زبان میں خدا کا حکم ہمارے پاس آجاتا ہے۔ خدا کہتا ہے کہ اس "آدم" کا جو حق تمہارے اوپر آتا ہے اس کو ادا کرو۔ بالفاظ دیگر، اس کے سامنے جھک جاؤ۔ اگر لفظی اعتراف کا معاملہ ہے تو لفظوں میں اس کی صداقت کا اعتراف کرو۔ اگر عملی حق کا معاملہ ہے تو عملی طور پر اس کا حق ادا کرو۔ ایسے موقع پر جو لوگ خدا کی خاموش آواز پر کان لگائیں اور فوراً اپنے آپ کو اس کی تعمیل کے لئے پیش کر دیں، وہ امتحان میں سچے اترے۔ اور جو لوگ "میرا درجہ بڑا ہے" "میں اس سے بہتر ہوں" "میں زیادہ طاقتور ہوں" جیسی نفسیات میں مبتلا ہو جائیں اور اپنے "آدم" کے آگے جھکنے سے انکار کر دیں، وہ امتحان میں پورے نہیں اترے۔ پہلی قسم کے لوگوں کے لئے فرشتوں والا انجام ہے اور دوسری قسم کے لوگوں کے لئے ابلیس والا انجام۔

انسان سے اصلاً جو چیز مطلوب ہے وہ یہی ہے کہ وہ خدا کے سامنے سجدہ کرے۔ مگر کوئی شخص حقیقۃً خدا کا ساجد بنا یا نہیں، اس کا امتحان اس کو "آدم" کے سامنے جھک کر دینا ہے۔ خدا کا ساجد اور عابد وہی ہے جو خدا کے حکم کو مان کر اپنے

حق دار انسان کے سامنے جھک جائے۔ جو شخص خدا کے سامنے سجدہ کرے اور جب انسان سے معاملہ پڑے تو اس کا حق نہ پہچانے اور گھمنڈ اور بے انصافی کا طریقہ اختیار کرے وہ خدا کا ساجد بھی نہیں ہے۔ کیوں کہ جہاں اس کا خدا اس کے ساجد ہونے کا امتحان لے رہا تھا وہاں وہ اپنے کو ساجد ثابت نہ کر سکا۔

خدا کو سجدہ کرنے کے لئے آدمی آسانی سے تیار ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ خدا کے مقابلہ میں کسی کے اندر "میں اس سے بڑا ہوں" کی نفسیات نہیں ہوتی۔ جب کہ انسان کے مقابلہ میں طرح طرح کی نفسیاتی گرہیں پڑی ہوئی ہوتی ہیں جو ایک انسان کے لئے دوسرے انسان کے اعتراف میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ خدا کسی انسان کا حریف نہیں۔ جب کہ ایک انسان بہت جلد دوسرے انسان کو اپنا حریف سمجھ لیتا ہے۔ اور اس کے مقابلہ میں جھکنے کو اپنے لئے عزت کا سوال بنا لیتا ہے۔ خدا کے مقابلہ میں آدمی کی نفسیات احتیاج کی نفسیات ہوتی ہے۔ خدا صرف دینے والا ہے۔ اس کو کسی سے لینے کی ضرورت نہیں۔ مگر انسان کا معاملہ مختلف ہے۔

یہاں جب ایک شخص دوسرے شخص کے سامنے جھکتا ہے تو وہ اس کو کچھ نہ کچھ دیتا ہے۔ کبھی اچھے الفاظ، کبھی دوسرے کی حقانیت کا اعتراف، کبھی اس کا مالی یا مادی حق ادا کرنا، کبھی کسی کو افضل پا کر خود پیچھے ہٹ جانا اور اس کو آگے بڑھانا، کبھی کسی کی کمزوری پر قابو پا لینے کے باوجود اس کی عزت کی خاطر درگزر کرنا۔ کبھی ایک شخص کی اتفاقی غلطی سے فائدہ اٹھانے کا موقع ہوتے ہوئے انصاف کی خاطر چپ رہ جانا۔ کبھی سامنے کے ملتے ہوئے نفع کو چھوڑ کر صرف اصول کی خاطر بے نفع والے آدمی کا ساتھ دینا، غرض ہر بار جب کسی کے لئے دوسرے آدمی کے سامنے جھکنے کا سوال ہو تو یہ اس

کو کچھ دینے کا سوال ہوتا ہے۔ ایک آدمی کو دوسرے آدمی کے مقابلہ میں حق و انصاف کا رویہ اختیار کرنے کے لئے اس کو اپنی نفسیاتی گرہوں کو توڑنا پڑتا ہے۔ جب وہ کسی حریف کی عزت کرتا ہے تو یہ اپنی عزت کو خطرہ میں ڈالنے کی قیمت پر ہوتا ہے۔

یہ چیز بس خدا کے سجدہ کے مقابلہ میں "آدم" کے آگے جھکنے کو کسی انسان کے لئے بے حد مشکل بنا دیتی ہیں۔ مگر انسان کا اصلی امتحان جہاں ہو رہا ہے، وہ یہی مقام ہے۔ یہی وہ اصل قربانی ہے جو ہر ایک کو اپنے خدا کی رضا کے لئے دینی ہے۔ جو اس قربانی کے لئے تیار نہ ہو وہ کبھی خدا کا محبوب بندہ نہیں بن سکتا۔ خواہ وہ بظاہر خدا کو سجدہ کرنے والا ہو یا سجدہ نہ کرنے والا۔

کسی شخص کو جو بڑائی ملتی ہے وہ خدا کی طرف سے ملتی ہے۔ اس لیے کسی شخص کی بڑائی کا اعتراف دراصل خدا کی تقسیم کے برحق ہونے کا اعتراف ہے، اور اس کی بڑائی کا انکار خدا کی تقسیم کے برحق ہونے کا انکار ہے۔ اسی طرح جب ایک شخص کسی حق کی بنا پر دوسرے آدمی کے آگے جھکتا ہے تو وہ حقیقتاً کسی آدمی کے آگے نہیں جھکتا بلکہ خدا کے آگے جھکتا ہے۔ کیوں کہ وہ خدا کے حکم کی تعمیل میں اس کے آگے جھک رہا ہے نہ کہ خود اس آدمی کے ذاتی فضل کی بنا پر۔

سب سے بڑی حقیقت اللہ رب العٰلمین ہے۔ اس ذات کو پالینا ہی آدمی کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ موجودہ دنیا میں آدمی جہاں اپنے رب کو پاتا ہے وہ "سجدہ" ہے، مگر سجدہ اسی وقت حقیقی سجدہ بنتا ہے جب کہ سجدہ سے باہر کی دنیا میں آدمی تواضع اور جھکاؤ کی زندگی اختیار کر چکا ہو۔ ایسا شخص اپنی نفسی حالت کے اعتبار سے اس قابل

ہو جاتا ہے کہ وہ خدا کی تجلیات کا آخذ (Recipient) بن سکے۔ اس کے لئے سجدہ حقیقی معنوں میں رب العالمین سے ملاقات کا مقام بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص باہر کی زندگی میں خود پسند اور متکبر بنا رہے، اس کی روح کے اندر شیطان اپنے گھونسلے بنا لیتا ہے۔ اس کا سجدہ غفلت اور بے کیفی کا سجدہ ہوتا ہے۔ اس کا کا سجدہ اس کو خدا سے قریب نہیں کرتا۔ اس کا سجدہ اس کو خدا سے نہیں ملاتا۔

اسلامی اخلاق

اسلامی اخلاق

اسلامی اخلاق کی حقیقت تواضع ہے۔ اسلامی اخلاق تواضع والے انسان کے کردار کا دوسرا نام ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: وَعِبَادُ الرَّحمٰن الذین یمشون علی الارض ھونا واذا خاطبھم الجاھلون قالو اسلاما (خدا کے بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں) یعنی جو لوگ خدا کے واقعی بندے بن جائیں وہ جب زمین پر چلتے ہیں تو ان کا چلنا عجز کا چلنا ہوتا ہے۔ جو لوگ خدا کے مقابلے میں اپنی بڑائی کا احساس کھو دیں وہ انسانوں کے درمیان بھی بڑے بن کر نہیں رہتے۔ خدا کی نسبت سے جس کیفیت کو خشوع کہا جاتا ہے وہی کیفیت جب بندوں کی نسبت سے ظاہر ہو تو اسی کو متواضع اخلاق کہتے ہیں۔ اور متواضع اخلاق ہی کا دوسرا نام اسلامی اخلاق ہے۔

حضرت عیاض بن حمار کی ایک روایت صحیح مسلم میں ان الفاظ میں آئی ہے:

ان اللہ تعالیٰ اوحیٰ الیّ ان تواضعوا حتی لا یبغی احد علی احد و لا یفخر احد علی احد

اللہ تعالیٰ نے مجھ پر یہ وحی کی کہ تم لوگ تواضع کا طریقہ اختیار کرو۔ یہاں تک کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص پر زیادتی نہ کرے۔ کوئی شخص کسی دوسرے

شخص پر فخر نہ کرے۔

خدا سے پانے کے لئے

اسلامی اخلاق کا نہایت گہرا تعلق خدا کی معرفت سے ہے۔ جب ایک شخص حقیقی معنوں میں خدا کو دریافت کرتا ہے تو اس پر یہ حقیقت کھلتی ہے کہ اس دنیا میں وہ آزاد نہیں ہے کہ جو چاہے کرے۔ وہ یہاں حالت امتحان میں ہے۔ خدا نے اس کو محدود مدّت کے لئے یہاں رکھا ہے۔ اس کے بعد اس پر موت طاری کر کے وہ اس کو اپنے یہاں بلائے گا۔ اور اس کے عمل کے مطابق اس کو یا جنت کے باغوں میں بسائے گا یا جہنم کی آگ میں ڈال دے گا۔

جب آدمی پر زندگی کی یہ حقیقت کھلتی ہے تو اس کا سب سے بڑا مسئلہ یہ بن جاتا ہے کہ وہ موت کے بعد آنے والی زندگی میں اپنے آپ کو خدا کی پکڑ سے بچائے۔ وہ آخرت میں خدا کی رحمت اور معافی حاصل کر سکے۔ اس کا یہ مزاج اس کی زندگی میں اس طرح داخل ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کے لئے حد درجہ نرم اور مہربان بن جاتا ہے۔ وہ لوگوں کو معاف کرتا ہے تاکہ خدا اس کو معاف کرے۔ وہ لوگوں کے ساتھ وسعتِ ظرف کا معاملہ کرتا ہے تاکہ خدا اس کے ساتھ وسعت اور رحمت کا معاملہ فرمائے۔

اس مومنانہ سلوک کو حدیث میں مختلف انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ یہاں ہم اس سلسلہ میں چند حدیثیں نقل کرتے ہیں:

انما یرحم اللہ من عبادہ الرحماء — بے شک اللہ اپنے بندوں میں سے مہربان بندوں پر مہربانی کرتا ہے۔ (الجامع الصغیر)

اِرْحَمُوْا يُرْحَمْ لَكُمْ
(الجامع الصغير)

تم لوگوں سے درگزر کرو، تمہارے ساتھ بھی درگزر کیا جائے گا۔

ارحم من فی الارض یرحمك من فی السماء (الجامع الصغیر)

تم زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تمہارے اوپر رحم کرے گا۔

مَنْ لَا يَرْحَمُ لَا يُرْحَمُ (متفق علیہ)

جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جائے گا

حضرت ابو ہریرہ سے ایک لمبی حدیث مروی ہے جس میں یہ الفاظ ہیں:

من نَفَّسَ عن مومن كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ الدُّنيَا نَفَّسَ اللّٰهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَمَنْ يَسَّرَ عَلٰى مُعْسِرٍ يَسَّرَ الله عليه فِي الدُّنيَا وَ الْاٰخِرَةِ وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِماً سَتَرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا والآخرة ۔ والله فی عون العبد ما كان العبد فی عون اخیه
(صحیح مسلم)

جو شخص ایک مومن کی دنیا کی مصیبتوں میں سے ایک مصیبت کو دور کرے گا تو اللہ اس کی قیامت کی مصیبتوں میں سے ایک مصیبت کو دور کرے گا۔ جو شخص ایک تنگدست کو آسانی دے گا تو اللہ دنیا اور آخرت میں اس کو آسانی دے گا۔ جو شخص ایک مسلم کی پردہ پوشی کرے گا تو اللہ دنیا اور آخرت میں اس کی پردہ پوشی کرے گا۔ اور اللہ بندہ کی مدد پر رہتا ہے جب تک کہ وہ اپنے بھائی کی مدد پر رہے۔

عن جریر بن عبد الله قال قال رسول الله صلّی الله علیه وسلم لا یرحم الله من لا یرحمُ النّاس (متفق علیہ)

حضرت جریر رض کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ اس شخص پر رحم نہ کرے گا جو لوگوں پر رحم نہ کرے۔

اعلیٰ ظرفی

ایک شخص نے ٹیکسی کرایہ پر لی۔ جب وہ سفر پورا کرکے اترا تو ٹیکسی والے نے پچاس روپیہ کرایہ بتایا۔ اب اگر مسافر کی جیب میں صرف پچاس روپے ہوں تو وہ ٹیکسی والے سے جھگڑا کرے گا۔ کیوں کہ وہ ڈرے گا کہ اس کو دے کر میں خالی ہو جاؤں گا۔ اس کے بعد میرے پاس کچھ نہیں رہے گا۔ وہ ٹیکسی والے سے کہے گا کہ تم نے کرایہ زیادہ بتایا ہے۔ مگر جس شخص کے بیگ میں پچاس ہزار روپیہ کے نوٹوں کے بنڈل بھرے ہوئے ہوں وہ کبھی پچاس روپیہ کے لئے جھگڑا نہیں کرسکتا۔ وہ فوراً ٹیکسی والے کو اس کا کرایہ ادا کرکے آگے بڑھ جائے گا۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جو شخص بڑی چیز پائے ہوئے ہو وہ کبھی چھوٹی چیز کے لئے جھگڑا نہیں کرتا۔ کم ظرفی چھوٹی یافت کا نتیجہ ہے اور عالی ظرفی بڑی یافت کا نتیجہ۔

خدا بلاشبہ سب سے بڑی حقیقت ہے۔ وہ تمام خوبیوں اور کمالات کا خزانہ ہے۔ جو شخص خدا کو پاتا ہے وہ گویا سب سے بڑی چیز کو پاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا دل سب سے بڑا دل بن جاتا ہے۔ اس کے اندر کھونے کو برداشت کرنے کی اتھاہ طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے اندر یہ مزاج آجاتا ہے کہ وہ اونچی سطح سے لوگوں کے ساتھ معاملہ کرسکے۔ اس کے اندر سے تنگ ظرفی کا مزاج ختم ہو جاتا ہے۔ لوگ اس کے ساتھ معاملہ کرنے میں اس کو اعلیٰ ظرف پاتے ہیں۔ وہ کردار اور اخلاق کے اعتبار سے ایک اونچا انسان بن جاتا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں قرآن میں ارشاد ہوا ہے: إِنَّكَ

لَعَلیٰ خُلُقٍ عَظِیْمٍ (القلم) یقیناً تم اعلیٰ اخلاق پر ہو۔ اعلیٰ اخلاق جوابی اخلاق نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ اصول کی بنیاد پر بنتا ہے۔ آدمی دوسروں کے ساتھ جو کچھ کرتا ہے یہ دیکھ کر نہیں کرتا کہ دوسرے لوگ اس کے ساتھ کیا کر رہے ہیں بلکہ یہ سوچ کر کرتا ہے کہ بہ اعتبار اصول اس کا رویہ کیا ہونا چاہئے اور کیا نہیں ہونا چاہئے۔ لوگوں کے درمیان اس کا سلوک لوگوں کی روش کے تابع نہیں ہوتا بلکہ خود اپنے معیار اخلاق کے تابع ہوتا ہے۔

یہی بات ہے جو حدیث میں ان الفاظ میں آئی ہے :

عن حُذَیْفَۃَ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: لاتکونوا امّعۃً تقولون اِنْ احسن الناس اَحسنّا واِنْ ظلموا اَظلمنا وَلٰکنْ وَطِّنُوا انفسکم اِنْ اَحسنَ النّاسُ اَنْ تُحْسِنُوا وَ اِنْ اَسَاؤُا فَلَا تَظْلِمُوا (مشکوٰۃ، باب الظلم) صفحہ ۱۴۱۸

حضرت حذیفہ رض کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ لوگو، اِمّعَہ نہ بنو۔ تم یہ کہنے لگو کہ اگر لوگ اچھا سلوک کریں گے تو ہم بھی اچھا سلوک کریں گے۔ اور اگر لوگ برا برتاؤ کریں گے تو ہم بھی برا برتاؤ کریں گے۔ بلکہ تم اپنے آپ کو تیار کرو کہ اگر لوگ اچھا سلوک کریں تب بھی تم ان سے اچھا سلوک کرو۔ اور اگر وہ برا سلوک کریں تو تم خود ان کے ساتھ ظلم نہ کرو۔

اسی بات کو ایک اور حدیث میں اس طرح بتایا گیا ہے:

عن عقبۃ بن عامر قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: اَلَا اُخْبِرُکَ بافضل اخلاق اھل الدنیا والاٰخرۃ

حضرت عقبہ رض کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا میں تم کو دنیا اور آخرت کے لوگوں کا بہترین اخلاق نہ بتاؤں۔

قال نعم - قال تصل من قطعك و تعطی من حرمك و تعفوا عمّن ظلمك (البیہقی)

کہا کہ ہاں - فرمایا کہ جو تم سے کٹے تم اس سے جڑو - جو تم کو محروم کرے تم اسے دو - اور جو شخص تم پر ظلم کرے اس کو تم معاف کر دو -

اسی لئے مذکورہ آیت (اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ) کی تشریح یہ کی گئی ہے کہ اس سے مراد خدا کے اُس حکم پر قائم ہونا ہے جو دوسرے مقام پر ان الفاظ میں آیا ہے: عفو و درگذر کا طریقہ اختیار کرو اور معروف کی تلقین کرو اور جاہلوں سے اعراض کرو (قیل هوما امره الله تعالیٰ به فی قوله: خذ العفو وأمر بالعرف واعرض عن الجاهلین، تفسیر نسفی جلد ۳، صفحہ ۲۷۹)

یعنی جہاں لوگ دوسروں سے بدلہ لیتے ہیں وہاں تم دوسروں کو معاف کر دو۔ جہاں لوگ دوسروں کے درمیان برائی پھیلاتے ہیں وہاں تم نیکی پھیلاؤ۔ جہاں لوگ دوسروں سے الجھ جاتے ہیں وہاں تم نظر انداز کر کے گزر جاؤ۔

اخلاق کی دو قسمیں

اسلامی نقطہ نظر سے اخلاق کی دو قسمیں ہیں - ایک پست اخلاق - دوسرے، اعلیٰ اخلاق - پست اخلاق کا کوئی مستقل اصول نہیں ہوتا جس کا ہمیشہ لحاظ کیا جائے۔ وہ حالات کے لحاظ سے بنتا ہے۔ اسی لئے وہ کبھی کچھ ہوتا ہے اور کبھی کچھ - جس موقع پر جس قسم کے جذبات آدمی کے اندر ابھرے وہی اخلاق اور کردار کی صورت میں ڈھل گئے۔

کسی کو اپنے سے کم دیکھا تو اس کو حقیر سمجھ لیا اور کسی کو اپنے سے زیادہ پایا تو اس کے خلاف حسد کرنے لگے۔ کسی سے فائدہ نظر آیا تو اس کے دوست بن گئے اور

کسی کو دیکھا کہ اس سے اپنا کوئی فائدہ وابستہ نہیں ہے تو اس سے بے رخی اختیار کر لی۔ کسی نے اچھا سلوک کیا تو اس کے لئے اچھے بن گئے۔ اور کسی نے برا سلوک کیا تو اس کے ساتھ برائی کرنا شروع کر دیا۔ اتفاق سے کوئی بڑی حیثیت حاصل ہو گئی تو گھمنڈ میں مبتلا ہو گئے۔ اور اگر کوئی بڑی حیثیت نہیں ملی تو مایوسی کا شکار ہو گئے۔ کسی سے خوش ہو گئے تو اس کے ساتھ فیاضی کرنے لگے اور اگر کسی سے ناخوش ہوئے تو اس کے لئے اپنے دروازے بند کر لئے۔ کسی کو اپنے موافق پایا تو اس کی تعریف کرنے لگے۔ اور اگر کسی سے ناموافقت ہو گئی تو سمجھ لیا کہ اس سے زیادہ برا کوئی آدمی نہیں۔

یہ سب پست اخلاق کے طریقے ہیں۔ اور مومن کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ پست طریقے سے بچے اور اعلیٰ اخلاقی طریقے اختیار کرے۔

اخلاق کی بلندی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی اعلیٰ اخلاق پر قائم تھے۔ اور آپ کا یہی مشن تھا کہ لوگوں کو اعلیٰ اخلاق اختیار کرنے کی تلقین کریں۔ ایک روایت کے مطابق آپ نے ارشاد فرمایا:

عن مالك انه بلغه ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: بعثت لاتمم حسن الاخلاق (موطا الامام مالک)	حضرت امام مالکؒ کہتے ہیں کہ انھیں یہ بات پہنچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ حُسن اخلاق کی تکمیل کروں۔

یہ روایت مختلف طریقوں سے آئی ہے۔ کسی میں حسن الاخلاق کا لفظ ہے، کسی میں صالح الاخلاق کا اور کسی میں مکارم الاخلاق کا۔ وہ مکارم اخلاق کیا ہیں جن

کی دعوت اور اقامت کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھیجے گئے۔ اس کی وضاحت دوسری روایت سے ہوتی ہے:

ثَلَاثٌ مِنْ مَكَارِمِ الْأَخْلَاقِ عِنْدَ اللهِ اَنْ تَعْفُوَ عَمَّنْ ظَلَمَكَ وَتُعْطِيَ مَنْ حَرَمَكَ وَتَصِلَ مَنْ قَطَعَكَ

(الجامع الصغیر، للسیوطی)

تین چیزیں اللہ کے نزدیک اعلیٰ اخلاق سے ہیں۔ یہ کہ جو شخص تم پر ظلم کرے تم اس کو معاف کردو۔ اور جو شخص تم کو محروم کرے تم اس کو دو۔ اور جو شخص تم سے کٹے تم اس سے جڑو۔

گویا اعلیٰ اخلاق وہ ہے جس میں آدمی فریق ثانی کی روش سے بلند ہوکر اس سے معاملہ کرے۔ وہ فریق ثانی کے رویہ سے متاثر ہوئے بغیر اس سے اچھی طرح پیش آئے۔ اس کا اخلاق مثبت اخلاق ہو نہ کہ جوابی اخلاق۔

قابل اعتماد اخلاق

ایک انجینئر جب لوہے کا پل بناتا ہے تو اس کو یقین ہوتا ہے کہ لوہا اس بوجھ کو بھرپور طور پر سنبھالے گا جس کو سنبھالنے کے لئے پل بنایا گیا ہے۔ انجینئر کو اگر لوہے کی اس خصوصیت پر یقین نہ ہو تو وہ کبھی لوہے کا پل بنانے کی ہمت نہ کرے۔ اسی طرح تمام مادی چیزوں میں کچھ متعین خواص (Properties) ہیں۔ یہ خواص اتنے یقینی ہیں کہ نہایت صحت کے ساتھ ان کی پیشین گوئی کی جا سکتی ہے۔ مادے کے خواص کی اسی قطعیت کی بنا پر تمدن کا سارا نظام چل رہا ہے۔ اگر مادی چیزیں اپنے خواص کو کھو دیں تو انسانی تمدن کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔

مادہ کے لئے خواص کی جو اہمیت ہے وہی اہمیت انسانی زندگی کے لئے اخلاق

کی ہے۔ اخلاق کی مضبوطی ہی وہ واحد چیز ہے جس پر سماجی زندگی کا نظام کھڑا ہوتا ہے۔ اگر لوگوں کے اندر اخلاقی مضبوطی باقی نہ رہے تو کبھی انسانی زندگی کی ٹھوس تعمیر ممکن نہ ہو۔

بہتر سماجی زندگی کے لئے ضروری ہے کہ اس کے افراد قابل پیشین گوئی کردار کے حامل ہوں۔ ایک شخص سے معاملہ کرتے ہوئے یہ یقین کیا جاسکے کہ وہ جو کہے گا اس کو وہ ضرور پورا کرے گا۔ ایک شخص کے سامنے ایک ثابت شدہ حق کو پیش کیا جائے تو ایسا ہونا چاہئے کہ ہم پیشگی طور پر یہ یقین کرسکیں کہ وہ اس کو ضرور قبول کرے گا۔ ایک شخص سے شکایت اور اختلاف ہوجائے تو یہ فضا ہونی چاہئے کہ ہم یہ یقینی اندازہ کرسکیں کہ وہ انصاف سے ہٹ کر کوئی کارروائی نہیں کرے گا۔ ایسے سماج کا انسان گویا لوہا انسان (لوہ پرش) ہے۔ وہ حدیدی کردار کا حامل ہے۔ اس سے ازروئے حق جو امید کی جاتی ہے وہ اس میں پورا اترتا ہے۔ جس سماج کے افراد ایسے ہوں اس سماج کی ترقی کو کوئی چیز روک نہیں سکتی۔

جس سماج کی حالت اس کے خلاف ہوجائے وہ ایک برباد سماج ہے۔ جہاں افراد کا حال یہ ہو کہ وہ اپنے وعدوں پر پورے نہ اتریں۔ ان کے سامنے حق آئے مگر وہ اس کو قبول نہ کریں۔ ان کو کسی سے شکایت ہوجائے تو وہ اس کے خلاف ہر کارروائی کرنے کے لئے تیار ہوجائیں، خواہ وہ کتنی ہی زیادہ انصاف اور انسانیت کے خلاف کیوں نہ ہو۔ جس سماج کی اخلاقی حالت ایسی ہوجائے وہ اس دنیا کی مانند ہے جہاں لوہے نے اپنا لوہا پن کھو دیا، جہاں پتھر پتھر نہ رہا، بلکہ وہ دیمک زدہ لکڑی کی طرح بے جان ہوگیا۔

قدرت کے باوجود

سب سے زیادہ سخت امتحان آدمی کا اس وقت ہوتا ہے جب کہ وہ اپنے مخالف پر قابو پا جائے۔ جب اس کا دشمن پوری طرح اس کی گرفت میں آچکا ہو۔ ایسے مواقع پر آدمی اپنی ساری طاقت استعمال کرکے اپنے مخالف کو پیس ڈالتا ہے۔ ایسے دشمن کے معاملہ میں آدمی اپنی کوئی اخلاقی ذمہ داری نہیں سمجھتا جو پوری طرح اس کے قبضہ میں آچکا ہو۔

مگر اللہ سے ڈرنے والے انسان کا حال یہ ہوتا ہے کہ اس وقت بھی خدا اس کے سامنے آکر کھڑا ہو جاتا ہے۔ خدا کی طاقت کا احساس اس کے ذہن پر اس طرح چھا جاتا ہے کہ انسان کی کمزوری اسے بھول جاتی ہے۔ وہ اپنے دشمن کو معاف کر دیتا ہے۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ یہی وہ موقع ہے جب کہ وہ اپنے دشمن کو معاف کر کے اپنے آپ کو عبدیت کے بلند ترین مرتبہ پر پہنچا سکتا ہے:

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ مُوسَی بنُ عمران علیہ السلام یَارَبِّ مَنْ اَعَزُّ عِبَادِكَ عِنْدَكَ ۔ قَالَ مَنْ اِذَا قَدَرَ غَفَرَ (البیہقی)

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے کہا کہ اے میرے رب، تیرے بندوں میں تیرے نزدیک سب سے زیادہ معزز بندہ کون ہے۔ اللہ نے فرمایا: وہ شخص جو قدرت پانے کے بعد معاف کر دے۔

غصہ نہیں

جو چیز اخلاق کی سب سے بڑی قاتل ہے وہ غصہ ہے۔ عام حالات میں اکثر لوگ

صحیح رہتے ہیں۔ مگر جب ایک آدمی کو کسی بات پر غصہ آجائے تو اس کے بعد وہ قابو سے باہر ہو جاتا ہے۔ اس وقت وہ بھول جاتا ہے کہ کوئی اخلاقی اصول ہے جس کو اسے ہر حال میں برتنا چاہئے۔

اس دنیا میں صرف ایک ہی چیز ہے جو غصہ اور اشتعال کی حالت میں آدمی کو حد کے اندر رکھ سکتی ہے، اور وہ خدا کا خوف ہے۔ اگر آدمی کے دل میں واقعۃً خدا کی عظمت بیٹھ جائے اور وہ جان لے کہ خدا اس سے اس کے تمام اعمال کا حساب لے گا تو یہ احساس اس کے اوپر ایک قسم کی لگام لگا دیتا ہے۔ خدا کا ڈر اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ایک حد سے آگے نہ جانے دے۔ اسی لئے قرآن میں خدا کے مومنین کی صفت یہ بتائی گئی ہے:

وَاِذَا مَا غَضِبُوْاهُمْ يَغْفِرُوْنَ (الشوریٰ) جب انھیں غصہ آتا ہے تو وہ معاف کر دیتے ہیں

خدا سے ڈرنے والوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ انھیں جب انسانوں کی طرف سے غصہ آتا ہے تو خدا کا تصور سامنے آکر ان کے غصہ کو دبا دیتا ہے۔ وہ انسان کے رویہ سے مشتعل ہوتے ہیں، مگر خدا کی پکڑ کا اندیشہ انھیں ٹھنڈا کر دیتا ہے۔ غصہ کے سلسلے میں چند حدیثیں یہ ہیں:

عن ابی هريرة ان رجلا قال للنبی صلی اللّٰه علیه وسلم اوصنی قال لا تغضب۔ فردد ذالك مرارا قال لا تغضب (صحیح بخاری)	حضرت ابو ہریرہ رضؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ مجھے نصیحت کیجئے آپ نے فرمایا غصہ نہ کر۔ آدمی نے بار بار پوچھا۔ آپ نے ہر بار فرمایا کہ غصہ نہ کر۔
عن ابی هريرة قال قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم ليس الشديد	حضرت ابو ہریرہ رضؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پہلوان وہ نہیں

بالصرعۃ انما الشدید من یملک نفسہ عند الغضب (صحیح مسلم) — ہے جو حریف کو بچھاڑ دے۔ پہلوان وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ کو قابو میں رکھے۔

اذا غضب احدکم فلیسکت (الجامع الصغیر) — جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو اس کو چاہئے کہ وہ چپ ہو جائے۔

غصہ دراصل ردعمل کا دوسرا نام ہے۔ ان آیتوں اور حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن کا طریقہ ردعمل کا طریقہ نہیں ہوتا۔ مومن کو کسی کے خلاف غصہ آتا ہے تو اس کے جواب میں وہ اس کو معافی لوٹاتا ہے۔ وہ منفی نفسیات سے اوپر اٹھ کر لوگوں سے معاملہ کرتا ہے۔ وہ غصہ اور تلخی کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ اندر ہی اندر اس کو پی جاتا ہے۔ مومن اس دنیا میں پھول کی طرح رہتا ہے۔ اس کو برا کہیں تب بھی وہ برا کہنے والے کو خوشبو دے گا۔ اس کو پتھر ماریں تب بھی اس کا سکون بھنگ نہیں ہوگا۔

غلطی ہو جانے کے بعد

انسان خواہ کتنا ہی اچھا ہو، دوسروں کے درمیان رہتے ہوئے بار بار اس سے غلطیاں ہوتی ہیں۔ بار بار لوگوں کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی ہو جاتی ہے۔ ایسے مواقع کے لئے یہ اخلاق بتایا گیا ہے کہ جب کوئی برائی ہو جائے تو فوراً بھلائی کرو۔ اس سے تمہاری برائی کا اثر دھل کر ختم ہو جائے گا۔ چنانچہ حدیث میں ارشاد ہوا ہے:

اِتَّقِ اللّٰہَ حَیْثُمَا کُنْتَ وَاَتْبِعِ السَّیِّئَۃَ الْحَسَنَۃَ تَمْحُھَا وَخَالِقِ النَّاسَ بِخُلُقٍ حَسَنٍ (الجامع الصغیر) — تم جہاں بھی ہو اللہ سے ڈرتے رہو۔ اور جب برائی ہو جائے تو اس کے بعد نیکی کرلو، وہ اس کو مٹا دے گی۔ اور لوگوں کے درمیان

اچھے اخلاق کے ساتھ رہو۔

برائی کے بعد اچھائی کرنے کی مختلف صورتیں ہیں۔ مثلاً جس کے ساتھ برائی ہوئی ہے اس سے معافی مانگنا۔ اس کے حق میں خدا سے اچھی دعائیں کرنا۔ اس کو ہدیہ دینا۔ اس کا ذکر لوگوں کے درمیان اچھے الفاظ سے کرنا۔ مختلف مواقع پر اس کی خیر خواہی کرنا، وغیرہ۔

جنت والے

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ جنت میں کوئی لغو بات یا گناہ کی بات نہ سنائی دے گی (واقعہ ۲۶) معلوم ہوا کہ جنت کا ماحول اعلیٰ اخلاق کا ماحول ہوگا۔ وہاں جھوٹ، تہمت، غیبت، بے ہودگی، گالی، طنز و تمسخر اور فضول باتیں نہیں ہوں گی۔ وہاں ہر ایک کے دل میں دوسرے کے لئے سلامتی اور خیر خواہی کے جذبات ہوں گے۔ وہاں ہر ایک وہی بولے گا جو اسے بولنا چاہئے اور وہ نہیں بولے گا جو اسے نہیں بولنا چاہئے۔ جنت بد اخلاق لوگوں کی سوسائٹی نہ ہوگی۔ جنت شریف انسانوں کا معاشرہ ہوگا۔

دنیا میں اچھے اخلاق والا بننا دراصل اسی جنتی سماج کا امیدوار بننا ہے۔ جو شخص دنیا میں جنتی اخلاق کا ثبوت دے وہی آئندہ جنت کے ماحول میں بسایا جائے گا۔ باقی تمام لوگ رد کرکے جہنم کے کوڑا خانہ میں ڈال دئے جائیں گے تاکہ ہمیشہ کے لئے اپنی بدکرداری کی سزا بھگتتے رہیں۔

اسلامی معاشرہ

اسلامی معاشرہ

سماج کیا ہے۔ بہت سے آدمیوں کا مل جل کر رہنا۔ جب بہت سے آدمی مل
ایک ساتھ رہیں تو ان کے درمیان طرح طرح کے تعلقات قائم ہوتے ہیں۔ کو
کسی کا رشتہ دار ہوتا ہے کوئی کسی کا پڑوسی۔ کوئی کسی کا ہم قوم ہوتا ہے کوئی ک
کا ہم وطن۔ کوئی تاجر ہوتا ہے اور کوئی گاہک۔ کوئی مالک مکان ہوتا ہے اور کو
کرایہ دار۔ اس طرح کے مختلف تعلقات کی بنا پر لوگوں کے درمیان بار بار معاملات
پیش آتے ہیں۔ ان معاملات کے دوران کبھی کسی سے نفرت کے اسباب پیدا ہوت
ہیں اور کسی سے محبت کے۔ کسی سے کچھ لینا ہوتا ہے اور کسی کو کچھ دینا۔ کسی سے اختلاف
ہوتا ہے اور کسی سے اتفاق۔ کوئی اپنا بن جاتا ہے اور کوئی غیر دکھائی دیتا ہے۔ یہی چ
ہے جو لوگوں کے درمیان سماجی تعلقات پیدا کرتی ہے۔ اور یہ سوال سامنے آتا ۔
کہ کیا کیا جائے اور کیا نہ کیا جائے۔ بہت سے پتھر ایک ساتھ پڑے ہوں تو ا
میں باہمی تعلقات قائم نہیں ہوتے، اس لئے ان کے درمیان مذکورہ قسم کے مسائل
بھی پیدا نہیں ہوتے۔ مگر جب بہت سے انسان ایک ساتھ مل کر رہیں تو ان میں باہ
تعلقات قائم ہوتے ہیں اور اس بنا پر ان کے درمیان طرح طرح کے مسائل بھی پید
ہوتے ہیں۔

قرآن کی سورہ الحجرات میں بتایا گیا ہے کہ ایمان والے لوگ آپس میں کس طرح رہیں۔ بتایا گیا ہے کہ وہ بھائیوں کی طرح مل جل کر رہیں۔ اگر کسی وجہ سے دو آدمیوں میں کوئی جھگڑا پیدا ہو جائے تو تمام لوگ اس کی اصلاح کے لئے دوڑ پڑیں، ویسے ہی جیسے کوئی اپنے گھر میں آگ لگتی ہوئی دیکھتا ہے تو اس کو بجھانے کے لئے دوڑ پڑتا ہے۔

اسی کے ساتھ ان تمام برائیوں سے بچنے کا اہتمام کیا جائے جو آپس کے تعلقات کو بگاڑنے والی ہیں۔ کسی شخص میں کوئی کمی دکھائی دے تو لوگ اس کی ہنسی نہ اڑائیں۔ عزت اور ذلت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اس لئے آدمی کو ڈرنا چاہئے کہ کیا معلوم دوسرا شخص خدا کے نزدیک مجھ سے بہتر قرار پائے۔ کوئی کسی کا کچھ کام بنا دے تو وہ اس کو طعنہ نہ دے، بلکہ یہ سمجھے کہ خدا نے ایک شخص کو مدد پہنچانے کے لئے اس کو اپنا ذریعہ بنایا۔ کسی کو بدنام کرنے کے لئے اس کا نام نہ بگاڑا جائے۔ ناکافی معلومات کے ساتھ کسی کے بارہ میں بدگمانی ہو جائے تو تحقیق کے بغیر اس کو نہ مانے۔ کوئی کسی کا بھید جاننے کی کوشش نہ کرے۔ جس طرح آدمی اپنے بھید کو چھپا ناپسند کرتا ہے اسی طرح اس کو پسند کرنا چاہئے کہ دوسرے کا بھید بھی چھپا رہے۔ کوئی شخص کسی کی غیبت نہ کرے۔ غیرموجود آدمی کا برائی کے ساتھ تذکرہ کرنا اس پر ایسی حالت میں حملہ کرنا ہے جب کہ وہ اپنے دفاع کے لئے موجود نہیں۔

ان تمام سماجی برائیوں سے بچنے کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ خدا کا خوف ہے۔ آدمی کے اندر اگر خدا کا خوف اور آخرت کا اندیشہ پیدا ہو جائے تو اس کے اندر تمام ضروری اوصاف پیدا ہو جائیں گے۔ یہ احساس آدمی کی زندگی میں ایک قسم کا چوکیدار بن کر شامل ہو جاتا ہے۔ وہ ہر اس موقع پر آدمی کو روک دیتا ہے جب کہ وہ اپنے بھائی کے ساتھ بے انصافی کرنے جا رہا ہو۔

اجتماعی زندگی کے لئے اسلام کی تعلیم کیا ہے۔ مسلمان جب ایک سماج کی صورت میں مل کر رہیں تو وہ آپس میں کس طرح رہیں اور معاملات میں ایک دوسرے کے سا[تھ] کس قسم کا سلوک کریں۔ اس کی مزید وضاحت کے لئے چند حدیثیں ملاحظہ فرمائیں:

عن انس رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: لا یومن احدکم حتی یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ (متفق علیہ)

تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک اس کا یہ حال نہ ہو جائے کہ وہ اپنے بھائی کے لئے وہی پسند کرے جو وہ خود اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: کلّ المسلم علی المسلم حرام دمہ ومالہ وعرضہ (مسلم)

ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کی تین چیزیں حرام ہیں اس کا خون، اس کا مال اور اس کی آبرو

عن عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ (متفق علیہ)

مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور جس کے ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ ہوں۔

عن النعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: مثل المومنین فی توادّھم وتراحمھم وتعاطفھم مثل الجسد اذا اشتکی

مسلمانوں کی مثال آپس کی محبت اور آپس کی رحم دلی اور آپس کی مہربانی کے معاملہ میں ایسی ہے جیسے ایک جسم۔ جب جسم کے کسی عضو کو تکلیف ہوتی ہے تو سارا جسم مل کر جاگتا ہے اور

منہ عضو تداعیٰ لہ سائر الجسد بالسّھر والحمّی (متفق علیہ)

سارا جسم بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

عن ابن عمر رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: المسلم اخو المسلم لا یظلمہ ولا یسلمہ من کان فی حاجۃ اخیہ کان اللہ فی حاجتہ ومن فرّج عن مسلم کربۃ فرّج اللہ عنہ بھا کربۃ من کُرب یوم القیامۃ ومن ستر مسلمًا سترہ اللہ یوم القیامۃ (متفق علیہ)

ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ نہ وہ اس پر ظلم کرتا اور نہ اس کو بے یار و مددگار چھوڑتا۔ جو شخص اپنے بھائی کی حاجت پوری کرے گا تو اللہ اس کی حاجت پوری کرے گا۔ جو شخص کسی مسلمان کی تکلیف دور کرے گا تو اللہ قیامت کے دن اس کی تکلیف دور کرے گا۔ جو شخص کسی مسلمان کو ڈھانکے گا تو اللہ قیامت کے دن اس کو ڈھانکے گا۔

عن عیاض بن حمار رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ان اللہ تعالیٰ اوحیٰ الیّ ان تواضعوا حتی لا یبغی احد علی احد ولا یَفْخُرَ احد علی احد (مسلم)

اللہ نے میری طرف وحی کی ہے کہ تم لوگ تواضع اختیار کرو۔ کوئی شخص کسی کے اوپر زیادتی نہ کرے۔ کوئی شخص کسی کے اوپر فخر نہ کرے۔

عن ابی موسیٰ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: المومن للمومن کالبنیان یشد بعضہ بعضاً وشبّک بین اصابعہ (متفق علیہ)

ایک مومن کی مثال دوسرے مومن کے لئے ایسی ہے جیسے عمارت۔ عمارت کی ایک اینٹ دوسری اینٹ کو مضبوط کرتی ہے اسی طرح سب مسلمان باہم جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کی روشنی میں اسلامی سماج کی جو تصویر بنتی ہے وہ یہ ہے کہ مومن دوسرے لوگوں کے درمیان اس طرح رہتا ہے کہ وہ ان کو غیر نہیں سمجھتا بلکہ اپنا ہی ایک حصہ سمجھتا ہے۔ دوسروں کے کسی رویہ سے جب اس کو خوشی محسوس ہوتی ہے تو وہ جان لیتا ہے کہ دوسرے کس بات سے خوش ہوں گے۔ اس لئے وہ خود بھی دوسروں کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرنے لگتا ہے۔ اسی طرح جب کسی کا ایک رویہ اس کے لئے تکلیف کا باعث ہوتا ہے تو اس کو معلوم ہوجاتا ہے کہ دوسرے کس چیز سے تکلیف محسوس کریں گے اور وہ اس کا سخت اہتمام کرتا ہے کہ دوسروں کو اس کی ذات سے اس قسم کے سلوک کا تجربہ نہ ہونے پائے۔ حتیٰ کہ ایک مسلم آبادی ایک واحد جسم کی مانند ہو جاتی ہے۔ جسم کے ایک حصہ میں تکلیف ہو تو ناممکن ہے کہ بقیہ جسم اس کے لئے تڑپ نہ اٹھے۔ اس طرح ایک مسلمان کی تکلیف سارے مسلمانوں کی تکلیف بن جاتی ہے۔ اور لوگوں کو اس وقت تک چین نہیں آتا جب تک وہ اپنے بھائی کی تکلیف دور نہ کردیں۔

اسلامی سماج ایک ایسا سماج ہے کہ جب بھی ایک شخص کا دوسرے سے واسطہ پڑتا ہے تو وہ اس کے اندر محبت اور رحم دلی اور مہربانی پاتا ہے۔ ہر ایک دوسرے کی حاجت برآری کے لئے اس طرح تیار رہتا ہے جیسے کہ وہ اس کا اپنا مسئلہ ہو۔ کوئی دوسرے شخص کو ننگا یا بے گھر دیکھتا ہے تو اس کو محسوس ہوتا ہے جیسے وہ خود ننگا اور بے گھر ہو گیا ہو کسی کو برداشت نہیں ہوتا کہ وہ دوسرے بھائی کو بے سہارا چھوڑ دے۔ ایک کو دوسرے سے ظلم اور گھمنڈ کے بجائے تواضع اور انصاف ملتا ہے۔ کوئی کسی کے اوپر فخر نہیں کرتا، کوئی کسی کے اوپر حسد نہیں کرتا۔ بلکہ ہر ایک

دوسرے کا خیر خواہ ہوتا ہے۔ ہر ایک دوسرے کا ساتھی بن جاتا ہے۔ مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح رہتے ہیں کہ ان کے لئے ناقابل تصور ہوتا ہے کہ وہ اپنے بھائی کے خون کو اپنے لئے جائز کر لیں خواہ اس سے کتنی ہی زیادہ تکلیف ان کو پہنچی ہو۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا مال لے لینے سے اس طرح بچتا ہے جیسے کوئی شخص آگ کو ہاتھ میں لینے سے بچتا ہے۔ ایک مسلمان کے لئے دوسرے مسلمان کی آبرو پر حملہ کرنا اسی طرح ناممکن ہو جاتا ہے جیسے اپنے آپ کو بر سر بازار ننگا کرنا۔

اسلامی سماج میں اس قسم کی فضا کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک حد درجہ متحد سماج بن جاتا ہے۔ جس سماج میں ہر ایک دوسرے کے ساتھ انصاف کرے۔ ہر ایک دوسرے کا خیر خواہ ہو اس سماج میں اتحاد کے سوا اور کیا چیز جگہ پائے گی۔ ایک مسلم آبادی اپنے تمام افراد کے ساتھ گویا ایک بہت بڑی عمارت ہوتی ہے۔ اس کا ہر فرد اس عظیم عمارت کی ایک اینٹ ہوتا ہے۔ ہر اینٹ دوسری اینٹ سے جڑی ہوتی ہے۔ ہر اینٹ دوسری اینٹ کو مضبوط کر رہی ہوتی ہے۔ ایک اینٹ اور دوسری اینٹ کے درمیان جو تعلق ہوتا ہے وہ دوری اور ٹکراؤ کا نہیں ہوتا بلکہ جوڑ اور پیوستگی کا ہوتا ہے۔ ہر اینٹ اگرچہ ایک دوسرے سے الگ ہوتی ہے مگر الگ ہونے کے باوجود وہ سماجی اعتبار سے پوری عمارت کا ایک اٹوٹ حصہ ہوتی ہے۔ اس سے عمارت کو طاقت ملتی ہے نہ کہ کمزوری۔ وہ اپنے اوپر عمارت کو تھامے ہوئے ہوتی ہے نہ کہ خود عمارت کو اپنے اوپر کھڑا کرنے کی کوشش کرے۔

ایک مومن جس خدا کا طالب ہوتا ہے دوسرا مومن بھی اسی خدا کا طالب ہوتا ہے

ایک مومن کی منزل مقصود جس طرح آخرت ہوتی ہے، دوسرے مومن کی منزل مقصود بھی اسی طرح آخرت ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں کیوں کر ممکن ہے کہ وہ ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ مزید یہ کہ وہ جانتے ہیں کہ یہ دنیا بھلائی اور برائی کی کش مکش کی جگہ ہے۔ یہاں شیطان کے ساتھی اپنے عمل کے لئے آزاد ہیں۔ جو شخص بھی بھلائی کے راستہ پر چلنا چاہے اس کو برائی کی طاقتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنا راستہ بنانا ہوگا۔ اس لئے ضروری ہے کہ سب مسلمان مل کر رہیں۔ باہم ملنے سے ان کی طاقت بہت بڑھ جائے گی۔ اور وہ زیادہ کامیابی کے ساتھ برائی کی طاقتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے رب کی طرف بڑھ سکیں گے۔

اس قسم کا اسلامی سماج کس طرح بنتا ہے۔ جواب یہ ہے کہ خوف خدا کے ذریعہ۔ دنیا کی تمام بھلائیوں کا راز یہ ہے کہ آدمی اللہ سے ڈرے۔ اور دنیا کی تمام برائیوں کی جڑ یہ ہے کہ آدمی کا سینہ اللہ کے ڈر سے خالی ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہی شخص دوسروں کے ساتھ اچھا سلوک کر سکتا ہے جو دوسروں کے معاملہ میں اللہ سے ڈرتا ہو۔ حضرت معمر تابعی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جن اصحاب سے میں ملا ان کو میں نے یہ کہتے ہوئے پایا کہ لوگوں میں تمہارا سب سے زیادہ خیر خواہ وہ ہے جو تمہارے معاملہ میں اللہ سے ڈرتا ہو (انصح الناس لك من خاف الله فيك، جامع العلوم والحکم ا ۷)

یہ ایک حقیقت ہے کہ اللہ کی پکڑ کے اندیشہ کے سوا کوئی چیز آدمی کو روکنے والی نہیں بن سکتی۔ جب آدمی پر ایک حیوانی جذبہ غالب آتا ہے، جب کسی معاملہ میں اس کا کوئی مفاد وابستہ ہو جاتا ہے، جب کوئی چیز اس کے لئے عزت و وقار کا مسئلہ بن

جاتی ہے تو اس وقت انسان وہ سب کچھ کر ڈالنا چاہتا ہے جو اس کے بس میں ہے۔ ایسے موقع پر صرف ایک ہی چیز ہے جو آدمی کو قابو میں رکھے اور اس کو انصاف کے راستہ سے ہٹنے نہ دے۔ اور وہ یہ احساس کہ ہر آدمی کا معاملہ اللہ کے یہاں پیش ہونا ہے اور ہر ایک کو اس کے کئے کا پورا بدلہ ملنا ضروری ہے۔ دنیا میں اگر کوئی شخص اپنے کو بچا بھی لے تو آخرت میں وہ اپنے آپ کو خدا کی پکڑ سے نہیں بچا سکتا۔

مسلمانوں کا سماج خیر خواہی اور انصاف کا سماج ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ان میں سے ہر شخص اللہ سے ڈرنے والا ہوتا ہے۔ ایک مسلمان کا معاملہ جب دوسرے مسلمان سے پیش آتا ہے تو اس کو وہ محض ایک انسانی معاملہ نہیں سمجھتا بلکہ ایک خدائی معاملہ سمجھتا ہے۔ اس کا ذہن یہ ہوتا ہے کہ میں ایک انسان سے نہیں بلکہ خدا سے معاملہ کر رہا ہوں جو تمام طاقتوں کا مالک ہے۔ ہر آدمی کے پیچھے اس کو خدا کھڑا ہوا نظر آتا ہے۔ ہر معاملہ اس کو ایک ایسا معاملہ دکھائی دیتا ہے جو آخرت کی عدالت میں پیش ہوگا۔ اور تمام کھلے اور چھپے کا جاننے والا مالک اس کے بارہ میں بے لاگ فیصلہ فرمائے گا۔ مسلمان یہ سمجھتا ہے کہ اس کو لازماً مرنا ہے اور مرنے کے بعد اللہ کے یہاں حساب کتاب کے لئے حاضر ہونا ہے۔ وہ اللہ سے اس بات کی دعائیں کر رہا ہوتا ہے کہ آخرت کی پیشی کے دن وہ اس کے ساتھ نرمی کا معاملہ فرمائے۔

اس کی یہ نفسیات اس کو دوسرے انسانوں کے معاملہ میں نرم کر دیتی ہے۔ وہ اپنے ساتھ دوسروں کی زیادتیوں کو معاف کر دیتا ہے تاکہ اس کا خدا قیامت کے دن اس کی زیادتیوں کو معاف کر دے۔ وہ خدا کے بندوں کے ساتھ فیاضی کا معاملہ کرتا ہے تاکہ خدا بھی اس کے ساتھ فیاضی کا معاملہ کرے۔ بندوں کی طرف سے اس کو

جتنا ملتا ہے اس سے زیادہ وہ ان کو لوٹاتا ہے تاکہ خدا اس کے حقیر عمل کے بدلے اپنے بڑے سے بڑے انعامات اس کے حصہ میں لکھ دے۔

اسلامی سماج میں آدمی اپنے حقوق سے زیادہ اپنی ذمہ داریوں کو دیکھتا ہے اور اختلاف وشکایت کے مواقع پر خود اپنے کو قصور وار مان لیتا ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ ایک شخص کا قرض تھا۔ وہ آیا اور آپ سے بہت بھدے انداز میں تقاضا کرنے لگا۔ آپ کے اصحاب جو اس وقت آپ کے ساتھ تھے، اس کی سخت باتوں کو سن کر بگڑ گئے اور اس کو مارنا چاہا۔ آپ نے منع فرمایا۔ آپ نے اس کے قصور کو اپنے آپ پر لیتے ہوئے فرمایا: اس کو چھوڑ دو۔ کیوں کہ ایک حق دار کو کہنے سننے کا حق ہے ردعوہ فان لصاحب الحق مقالاً (متفق علیہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی ذات سے نمونہ قائم کر کے حق دار کو کہنے سننے کا موقع دیا اور اس طرح ہر قسم کے سماجی فساد کی جڑ کاٹ دی۔

اسلامی سماج میں یہ مزاج ہوتا ہے کہ دوسروں کے ساتھ حد درجہ رعایت کی جائے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک اعرابی آیا اور مدینہ کی مسجد نبوی میں پیشاب کرنے لگا۔ لوگ اس کو پکڑنے اور مارنے کے لئے دوڑے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو آپ نے لوگوں کو منع فرمایا اور اس کو پیشاب کرنے سے نہ اٹھایا۔ آپ نے کہا: اس اعرابی کو چھوڑ دو اور اس نے جہاں پیشاب کیا ہے وہاں ایک ڈول پانی ڈال دو۔ کیوں کہ تم آسانی پیدا کرنے کے لئے بھیجے گئے ہو، تم مشکل پیدا کرنے کے لئے نہیں بھیجے گئے (بخاری)

عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ نرم

ہے اور سارے معاملات میں نرمی کو پسند کرتا ہے (ان اللہ رفیق یحب الرفق فی الامر کلہ، متفق علیہ) یہ نرمی اور رعایت اسلامی سماج کی اہم ترین خصوصیت ہے۔ اسلامی سماج ایک با اصول سماج ہے مگر اس کے ساتھ وہ حد درجہ نرمی اور رعایت کا سماج ہے۔ مومن وہ ہے جو اپنے لئے شدت اور دوسرے کے لئے رعایت کو پسند کرے۔

اسلامی سماج میں کم بولنے اور زیادہ عمل کرنے کا ماحول ہوتا ہے۔ انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک مسلمان کا انتقال ہوا۔ وہ ایک جہاد میں لڑ کر مرا تھا۔ ایک شخص نے کہا: اس کو جنت کی خوشخبری ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو فرمایا: تم کو کیا معلوم شاید وہ شخص بے فائدہ باتیں کرتا رہا ہو اور ایسے خرچ میں بخل کرتا رہا ہو جس میں اس کا نقصان نہ تھا (لعلہ تکلم بما لا یعنیہ او بخل بما لا یغنیہ، ترمذی) اسی طرح ایک موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ——— اللہ تمہاری صورتوں کو نہیں دیکھتا وہ تمہارے عمل کو دیکھتا ہے (ان اللہ لا ینظر الی صورکم ولکن ینظر الی اعمالکم) اسلامی سماج بے حد سنجیدہ سماج ہوتا ہے۔ اس لئے وہاں کوئی شخص غیر ضروری کلام نہیں کرتا۔ ہر شخص کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو ضروری کاموں میں مشغول رکھے۔

اسلامی سماج میں اپنی محنت پر بھروسہ کرنے کا ماحول ہوتا ہے۔ آدمی مانگ کر حاصل کرنے کے بجائے کر کے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ آدمی یہ نہیں سوچتا کہ جو کچھ دوسروں کے پاس ہے وہ بس چھین کر یا مطالبہ کر کے حاصل کر لوں بلکہ ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اللہ نے مجھ کو ہاتھ پاؤں اور دل و دماغ کی جو صلاحیت

دی ہے اس کو بروئے کار لاکر اپنی زندگی اپنے آپ بناؤں۔

ابوعبد الرحمٰن عوف بن مالک اشجعی رضؓ کہتے ہیں۔ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے، اور ہم تقریباً نو آدمی تھے۔ آپ نے فرمایا: کیا تم رسول خدا سے بیعت نہیں کرتے۔ چوں کہ ہم جلدی بیعت کرچکے تھے، ہم نے کہا کہ اے خدا کے رسول ہم بیعت کرچکے ہیں۔ آپ نے دوبارہ فرمایا: کیا تم رسول خدا سے بیعت نہیں کرتے، ہم نے اپنے ہاتھ پھیلا دئے اور کہا: اے خدا کے رسول ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں۔ پھر ہم کس چیز پر بیعت کریں۔ آپ نے فرمایا: یہ کہ تم اللہ کی عبادت کروگے اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کروگے۔ اور پانچ وقت کی نماز اور اطاعت۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا: ولا تسألوا الناس شیئا (اور تم لوگوں سے کوئی چیز نہ مانگوگے) راوی کہتے ہیں کہ ان میں سے بعض کو میں نے دیکھا کہ وہ گھوڑے پر سوار ہے اور اس کا کوڑا گر گیا ہے تو وہ کسی سے مانگتا نہیں بلکہ اتر کر خود کوڑے کو اٹھاتا ہے (مسلم) اس کا مطلب ہے کہ اسلامی سماج میں مانگنے اور مطالبہ کرنے کا ماحول نہیں ہوتا۔ ہر شخص اپنے ہاتھ کی کمائی کھاتا ہے اور اپنی ذاتی محنت پر بھروسہ کرتا ہے۔

ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان کھڑے ہوئے۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنا اور اللہ پر ایمان لانا سب سے افضل اعمال ہیں۔ ایک شخص اٹھا اور اس نے کہا: اے خدا کے رسول کیا اگر میں اللہ کے راستہ میں مارا جاؤں تو میری خطائیں بخش دی جائیں گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: ہاں، اگر تم اللہ کے راستہ میں مارے جاؤ، اس

حال میں کہ تم صبر کرنے والے اور خالص اللہ کے لئے لڑنے والے ہو۔ آگے بڑھنے والے ہو پیچھے ہٹنے والے نہیں ہو تو تم بخش دئے جاؤ گے۔ کچھ دیر کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ پوچھا: تم نے کس طرح کہا تھا۔ اس نے اپنے سوال کو دہرایا۔ آپ نے دوبارہ اپنے جواب کو دہراتے ہوئے کہا: ہاں، اگر تم اللہ کے راستہ میں مارے جاؤ، اس حال میں کہ تم صبر کرنے والے اور خالص اللہ کے لئے لڑنے والے ہو، آگے بڑھنے والے ہو پیچھے ہٹنے والے نہیں ہو تو تم بخش دئے جاؤ گے۔ لیکن اگر تمہارے اوپر قرض ہے تو اس کی بخشش نہ ہوگی۔ کیونکہ ابھی جبریل نے مجھ کو یہ بتایا ہے

(الا الدین فان جبریل قال لی ذالک، مسلم)

اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی سماج میں ہر آدمی بے حد محتاط ہوتا ہے کہ اس کے ذمہ کسی کا قرض یا حقوق باقی نہ رہ جائیں۔ ایک مسلمان کا ذہن یہ ہوتا ہے کہ دین کی راہ میں خواہ میں کتنی ہی بڑی قربانی کروں مگر اللہ کی نظر میں میری قیمت اسی وقت ہوگی جب کہ میں اللہ سے اس طرح ملوں کہ میں نے کسی کا حق نہ دبایا ہو، میرے ذمہ لوگوں کے مطالبات نہ ہوں۔ اگر میرے ذمہ کسی انسان کا حق ہے اور میں اس کو ادا نہیں کرتا تو دین کی راہ میں میرا جان دے دینا بھی مجھ کو آخرت میں نجات نہ دے سکے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگو صدقہ کرو۔ ایک شخص نے پوچھا: اے خدا کے رسول اگر آدمی کے پاس مال نہ ہو۔ آپ نے فرمایا کہ پھر وہ لوگوں سے بھلی بات کہے۔ کیوں کہ وہ بھی صدقہ ہے۔ آدمی نے دوبارہ پوچھا: اے خدا کے رسول اگر اس کے پاس بھلی بات بھی نہ ہو۔ آپ نے فرمایا: پھر وہ دوسروں کو اپنے

شر سے بچائے (یدع الناس من شرہ) اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی سماج میں سب سے بہتر آدمی وہ ہے جو لوگوں کے لئے سب سے زیادہ نفع بخش ہو۔ اللہ نے اس کو جو کچھ دیا ہے اس میں سے وہ دوسروں کو دیتا رہے۔ اس کے قول و عمل سے دوسروں کو فائدہ پہنچے۔ اس کے بعد کم سے کم درجہ یہ ہے کہ آدمی اپنی ذات سے کسی کو نقصان نہ پہنچنے دے۔ اگر وہ دوسروں کو کچھ نہ دے سکے تو وہ دوسروں کو محروم بھی نہ کرے۔ اگر وہ دوسروں کے کام نہ آئے تو دوسروں کے کام بگاڑنے کی کوشش بھی نہ کرے۔ اگر دوسروں کے لئے اس کے پاس میٹھے بول نہ ہوں تو وہ ان کو کڑوے بول بھی نہ دے۔

امام مالک نے موطا میں روایت کیا ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا : مجھے ایسی بات بتائیے جس کے ساتھ میں جیوں (یا رسول اللہ علمنی کلمات اعیش بھن) آپ نے فرمایا غصہ نہ کر (لا تغضب) اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی سماج مثبت نفسیات رکھنے والوں کا سماج ہے۔ اس کے افراد ہر قسم کی منفی نفسیات سے پاک ہوتے ہیں۔ غصہ ہر قسم کی منفی نفسیات کی جڑ ہے۔ "غصہ نہ کر" کا مطلب یہ ہے کہ منفی نفسیات میں نہ جیو بلکہ مثبت نفسیات میں جیو۔ دوسروں کی طرف سے اشتعال انگیزی ہو یا دوسروں سے تم کو تکلیف پہنچے تو اس کا جواب تم غصہ، نفرت، انتقام، حسد اور حقارت جیسے جذبات سے نہ دو بلکہ محبت، انصاف، خیر خواہی اور عفو و درگزر کا طریقہ اختیار کرو۔ جب بھی کوئی معاملہ پیش آئے تو ٹھنڈے دل سے سوچو اور صرف وہ کرو جو اللہ کی رضا کے اعتبار سے سب سے بہتر ہو نہ کہ وہ جس سے تمہارے بھڑکتے ہوئے جذبات کو تسکین مل

رہی ہو۔کسی کے خلاف تمہاری کارروائی جوابی کارروائی نہ ہو بلکہ اللہ کی جواب دہی کو سامنے رکھتے ہوئے ایک سوچی سمجھی کارروائی ہو۔ تمہاری غذا غصہ اور نفرت اور انتقام نہ ہو، بلکہ برداشت کرنا اور معاف کر دینا ہو۔ تم غصہ نہ کرنے میں جیو، نفرت نہ کرنے میں جیو، انتقام نہ لینے میں جیو، حسد نہ کرنے میں جیو۔

اسلامی معاشرہ میں جب ایک شخص دوسروں سے انصاف کرتا ہے اور ان کے حقوق ادا کرتا ہے تو یہ اس کے لئے عام معنوں میں محض ایک اخلاقی یا انسانی معاملہ نہیں ہوتا۔ یہ اس کے لئے ایسا مسئلہ ہوتا ہے جس پر آخرت میں اس کی نجات کا انحصار ہو۔ جو شخص بندوں کے ساتھ بہتر سلوک کرے وہی آخرت میں اس قابل ٹھہرے گا کہ خدا اس کے ساتھ بہتر سلوک کرے۔ اور جو شخص دوسرے انسانوں کے ساتھ بہتر سلوک نہ کرے اس کے لئے آخرت میں خدا کی رحمتوں میں کوئی حصہ نہیں۔

یہی دنیا کی زندگی میں آدمی کا امتحان ہے اور یہ امتحان خاص طور پر کمزور اور بے سہارا انسانوں کے بارہ میں لیا جاتا ہے۔کیوں کہ ایسے افراد کے ساتھ بہتر سلوک کے لئے خدا کی رضا کے سوا اور کوئی محرک نہیں ہوتا۔ آدمی جب طاقت ور کے ساتھ بہتر سلوک کرے تو اس میں یہ امید شامل رہتی ہے کہ دوسرے شخص کی طرف سے کسی نہ کسی صورت میں اس کا بدلہ ملے گا۔ اسی طرح جب کسی عوامی موقع پر آدمی انسانیت دوستی کا ثبوت دیتا ہے تو اس میں بھی یہ امید ہوتی ہے کہ اس سے آدمی کی شہرت و عزت میں اضافہ ہوگا۔ مگر جب ایک تنہا اور بے زور آدمی اس کے سامنے ہو اور اس سے مدد کی درخواست کرے تو

وہاں اس قسم کی کوئی کشش موجود نہیں ہوتی۔ اور اگر یہ بے زور شخص ایک ایسا شخ
ہو جس سے آدمی کو تکلیف اور شکایت پہنچی ہے تو ایسے موقع پر یہ عدم جاذبیت ا
زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اس وقت جو آدمی بے غرض ہو کر اور شکایات سے اوپر اٹھ کر
اس کی مدد کرتا ہے تو وہ خالص خدا کے لئے ایسا کر رہا ہے، کیوں کہ خدا کی رض
کے سوا کوئی دوسری کھینچنے والی چیز وہاں موجود نہیں۔

جہاں ہر قسم کی دوسری کشش ختم ہو جائے وہاں خدا کی کشش موجود ہوتی۔
اور جو شخص خالص خدا کے لئے دوسرے کے ساتھ اچھا سلوک کرے وہ خد
کا محبوب ترین بندہ ہوتا ہے۔ وہ عین اس مقام پر خدا کو پالیتا ہے جہاں اس
نے خالص خدا کی خاطر کسی بندے کا آنسو پونچھا تھا۔

تنظیم

تنظیم

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ان میں بارہ نقیب مقرر کئے اور اللہ نے ان سے کہا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، اگر تم نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ ادا کرو اور میرے رسولوں کو مانو اور ان کی مدد کرو اور اللہ کو قرض حسن دو۔ اگر تم ایسا کرو تو یقیناً میں تمہاری برائیوں کو تم سے دور کردوں گا اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ پس اس کے بعد تم میں سے جس نے انکار کیا تو اس نے سواء السبیل کھودی (مائدہ ۱۲)

ایک دانہ کے اندر خدا نے ایک سرسبز پودا چھپا رکھا ہے اور ایک گٹھلی کے اندر ایک پورا درخت موجود ہے۔ مگر یہ امکانات صرف اس وقت بروئے کار آتے ہیں جب کہ دانہ یا گٹھلی کو مٹی میں ڈالا جائے۔ اگر ان کو شیشہ کی میز پر سجا کر رکھ دیا جائے تو نہ دانہ سے پودا نکلے گا اور نہ گٹھلی کبھی درخت کی صورت اختیار کرے گی۔ اسی طرح اللہ نے دنیا کی ہر چیز کا ایک قاعدہ مقرر کر دیا ہے۔ یہ قاعدہ ہمیشہ کے لئے اٹل ہے۔ ہر چیز اسی مقرر قاعدہ پر قائم ہوتی ہے۔ اور اسی کے مطابق بڑھتی ہے۔ اگر اس قاعدہ کی خلاف ورزی کی جائے تو کبھی مطلوبہ نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔

یہی معاملہ انسانی زندگی کا بھی ہے۔ جو قوم آسمانی کتاب کی حامل ہو اس کے لئے اللہ تعالیٰ کا مخصوص ضابطہ ہے۔ ایسی قوم کس طرح زمین میں جڑ پکڑتی ہے اور دنیا و آخرت میں فلاح حاصل کرتی ہے، اس کا ضابطہ مذکورہ آیت میں بیان کر دیا گیا ہے۔ اسی قرآنی ضابطہ کو یہاں سواء السبیل کہا گیا ہے۔

سواء السبیل (اللہ تک پہنچنے کا سیدھا راستہ) یہ ہے کہ آدمی دنیا میں ایک قسم کی پابند زندگی گزارے۔ وہ اس طرح رہے گو یا کہ وہ خدا کے عہد کی رسی میں بندھا ہوا ہے۔ اس عہد کی زندگی کی پہلی شرط، ایمان کے بعد، یہ ہے کہ آدمی نماز قائم کرے۔ یعنی اللہ کے آگے اپنے کو جھکا دے، وہ اللہ کی قربت تلاش کرنے والا بن جائے۔ پھر وہ زکوٰۃ ادا کرے۔ یعنی وہ دوسرے بندوں کا اس حد تک خیرخواہ ہو کہ اپنی کمائی میں ان کا لازمی حق سمجھنے لگے۔ پھر یہ کہ اللہ کے دین کی دعوت کے معاملہ میں وہ غیر جانب دار نہ رہے، بلکہ اس میں اپنے آپ کو پوری طرح شامل کرے۔ وہ داعیان دین کی مدد کرے۔ اپنے بہترین اثاثہ کو اس کام کو موثر اور طاقت ور بنانے میں لگا دے۔ یہی وہ عہد کی زندگی ہے جو ہر فرد مسلم سے مطلوب ہے، اس زندگی کو اختیار کئے بغیر کوئی شخص خدا کی قربت و معیت حاصل نہیں کر سکتا اور نہ اس قابل قرار پا سکتا کہ خدا اس کی مدد کرے۔

اس خدا پرستانہ زندگی کو اس کی صحیح صورت میں باقی رکھنے کے لئے تنظیم کا حکم دیا گیا ہے۔ ہر مسلم معاشرہ کے اوپر خدا کا یہ فریضہ ہے کہ وہ اپنے درمیان سمع و طاعت کا نظام قائم کرے۔ یعنی وہ اپنے اندر سے کچھ لوگوں کو اپنا سربراہ مقرر

کرے۔اور جب ان کا تقرر ہو جائے تو ذاتی پسند و ناپسند کو نظر انداز کر کے وہ ان کی اطاعت کرے۔ نماز کی باقاعدہ اقامت، زکوٰۃ کی اجتماعی وصولی او ر تقسیم، دعوت دین کا عمومی نظام، سب اسی وقت بہتر طور پر ادا ہوسکتے ہیں جب کہ مسلمانوں کے درمیان اجتماعی نظم قائم ہو، ان میں کچھ ایسے لوگ مقرر ہوں جو اس کی نگرانی کریں اور تمام لوگ اس کو ایک دینی فریضہ سمجھ کر اپنے سربراہوں کی اطاعت کریں۔

اس تنظیم سے مراد حکومتی تنظیم نہیں ہے بلکہ وہ تنظیم ہے جو ہر حال میں مسلمانوں کے اپنے بس میں ہے، خواہ ان کے پاس سیاسی اقتدار ہو یا نہ ہو۔ اسلامی تنظیم حقیقتاً ایک عبادت ہے اور عبادت وہی مطلوب اور نتیجہ خیز ہے جو اختیاری طور پر ہو نہ کہ کسی خارجی دباؤ کے تحت۔ اسلامی تنظیم در اصل اس بات کی ایک دنیوی علامت ہے کہ آدمی نے اپنے آپ کو خدا کے حکم کے حوالے کر دیا ہے۔ اسلامی تنظیم میں اپنے کو باندھنا گویا خدائی اطاعت کے امتحان میں پورا اترنا ہے اور اسلامی تنظیم میں بندھنے کے لئے تیار نہ ہونا گویا اس خدائی امتحان میں ناکام ہو جانا ہے۔

مزید یہ کہ سیاسی اقتدار بذات خود تنظیم کے وجود کا ضامن نہیں ہے حضرت عثمان رض اور حضرت علی رض کے زمانہ میں حکومتی اقتدار موجود تھا، اس کے باوجود مسلمانوں کی تنظیم منتشر ہوگئی۔ اسی طرح بعد کے دور میں بھی اس مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تنظیم سے مراد ویسی ہی ایک اختیاری تنظیم ہے جیسی کہ مسجد میں امام کی سربراہی میں نماز کی جماعت بندی کے لئے ہر روز ہوتی ہے۔ یہ اللہ کی خاطر اپنی آزادی پر پابندی لگانا ہے۔ یہ تمام تر ایک اختیاری تنظیم ہے اور اس کا ثواب کسی آدمی کو صرف اس وقت ملے گا جب کہ اس نے اپنے آزاد ارادہ سے

اس کی ماتحتی قبول کی ہو۔ جبر کے تحت قائم شدہ تنظیم بعض دنیوی فائدے دے سکتی ہے مگر وہ آدمی کو خدا کے یہاں ثواب کا مستحق نہیں بناتی، نہ اس سے وہ برکتیں ظاہر ہوسکتیں جو حقیقی اسلامی تنظیم کے لئے خدا نے مقدر کی ہیں۔

دور نبوت میں اس قسم کی تنظیم کی ایک مثال وہ ہے جو ابتدائی زمانہ میں مدینہ میں اختیار کی گئی۔ ہجرت سے پہلے مدینہ کے ۷۳ آدمی مکہ پہنچے اور آپ سے بیعت ہوئے۔ اس وقت مدینہ میں اسلامی حکومت قائم نہیں ہوئی تھی۔ مگر آپ نے بیعت کے بعد ان سے کہا کہ تم لوگ بارہ آدمی منتخب کرو جن کو میں تمہارے اوپر نقیب (نگراں) بنا دوں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے اندر سے بارہ آدمی چنے۔ آپ نے ان کو مدینہ کے مسلمانوں پر نگراں مقرر فرمایا اور کہا کہ تم اپنی قوم کی اجتماعی دیکھ بھال کے ذمہ دار ہو (انتم کفلاء علیٰ قومکم)

مسلمان عرب سے نکل کر جب مختلف ملکوں میں گئے تو اسی طرح وہ اپنی تنظیم بنا کر اس کی ماتحتی میں منظم زندگی گزارتے رہے۔ جب تک انھوں نے ایسا کیا ان کے اوپر خدا کا سایہ باقی رہا۔ جب انھوں نے تنظیمی پابندی قبول کرنے سے انکار کر دیا تو خدا کا سایہ بھی ان کے اوپر سے اٹھ گیا۔ اور حکومتی اقتدار کے باوجود وہ دوسری قوموں کے حوالے کر دئے گئے۔

جو لوگ اپنے آزاد ارادہ سے اپنے کو ایک اسلامی تنظیم کا پابند کرلیں وہ اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ وہ بےنفس لوگ ہیں، انھوں نے اللہ کی خاطر اپنی انانیت کو ختم کر دیا ہے۔ اس طرح اپنے آپ کو بےنفس بنا لینا موجودہ دنیا کی سب سے بڑی نیکی ہے۔ اللہ کی نظر میں جو لوگ اس معیار پر پورے اتریں ان

کے لئے وہ اپنی ہر قسم کی نعمتیں انڈیل دیتا ہے۔ وہ دنیا میں بھی عزت اور غلبہ حاصل کرتے ہیں اور آخرت کی سرفرازی بھی ان کے لئے مقدر کر دی جاتی ہے۔ جو لوگ بے نفسی کی حد تک خدا کے فرماں بردار بن جائیں ان کے سامنے جب کوئی صحیح بات آتی ہے تو وہ فوراً اس کو مان لیتے ہیں۔ ان کا باہمی اتحاد کبھی نہیں ٹوٹتا۔ وہ انصاف کے راستہ کو کبھی نہیں چھوڑتے۔ ان کی بے نفسی ان کو ہر اس چیز کی طرف بڑھنے سے روک دیتی ہے جو دنیا و آخرت میں برباد کرنے والی ہیں

حقیقت یہ ہے کہ دنیا و آخرت کی تمام بھلائیوں کا راز بے نفسی ہے۔ اور کوئی آدمی بے نفس بنا ہے یا نہیں، اس کا سب سے بڑا ثبوت تنظیم کے ذریعہ ملتا ہے۔ تنظیمی زندگی میں اپنے آپ کو باندھنا اس کے بغیر نہیں ہوسکتا کہ آدمی نفسانی محرکات سے اوپر اٹھ گیا ہو۔ وہ تنقید اور تعریف سے بلند ہو۔ وہ اختلاف اور اتفاق کی بنیاد پر کسی کے بارے میں رائے قائم نہ کرتا ہو۔ اس کا رویہ پسند ناپسند کی بنیاد پر نہ بنتا ہو۔ وہ اس سے بے نیاز ہو چکا ہو کہ اس کو کیا ملا اور کیا نہیں ملا۔ تنظیمی زندگی میں اس طرح کے مواقع بار بار آتے ہیں۔ اگر آدمی ان چیزوں سے اوپر اٹھا ہوا نہ ہو تو وہ اسی قسم کی باتوں میں الجھ کر رہ جائے گا اور تنظیم کی پابندی کو قبول کرنے میں ناکام رہے گا۔

اللہ کے مومن بندوں پر اللہ کی دو سب سے بڑی نعمتیں نازل ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ خدا کی نصرت کے مستحق بن جاتے ہیں، وہ دنیا میں اپنے مخالفین کے مقابلہ میں خدا کی مدد سے غالب آتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ موت کے بعد وہ جہنم سے بچا کر جنت میں داخل کر دئے جاتے ہیں۔ اللہ کی یہ دونوں نعمتیں صرف ان لوگوں کے لئے ہیں

جو اللہ کی خاطر اپنی انفرادیت کو ختم کر کے اجتماعیت کے بندھن میں بندھ جائیں۔ اور اس کے تحت اپنی دینی اور اخلاقی زندگی کو منظم کریں۔

جو لوگ اپنے آپ کو اللہ میں اس طرح شامل کر لیں کہ اپنی انفرادیت کو وہ اس کے حوالے کر دیں، ان کی طاقت بے پناہ ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ ان کے درمیان وہ تمام اسباب بالکل ختم ہو جاتے ہیں جو ایک کو دوسرے سے جدا کرنے والے ہیں۔ اجتماعیت کو توڑنے والی چیز انفرادیت پر اصرار ہے۔ اور اپنی انفرادیت کو اللہ کے حوالے کر کے پہلے ہی وہ اس سے اوپر اٹھ چکے ہیں۔ ایسے لوگوں کا پورا گروہ ایک متحدہ طاقت میں ڈھل جاتا ہے۔ اور جہاں اتحاد ہو وہاں مغلوبیت کا گزر نہیں۔

اسلام سے پہلے عرب میں قبائلی دور تھا۔ یہ قبیلے الگ الگ آباد تھے۔ ان کے درمیان وحشت کا راج تھا۔ وہ اکثر ایک دوسرے کے خلاف لڑتے رہتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جب ان کو خدا کے دین کی دعوت پہنچی تو وہ اسلام کے دائرہ میں داخل ہو گئے۔ اس کے بعد ان کی آپس کی لڑائیاں ختم ہو گئیں۔ وہ آپس میں بھائی بھائی کی طرح مل کر رہنے لگے۔

اس کی وجہ مزاج کا فرق ہے۔ غیر اسلام میں ہر آدمی اپنا وفادار رہتا ہے۔ اور اسلام میں صرف ایک اللہ کا۔ جس سماج میں لوگ اپنے یا اپنے گروہ کے وفادار ہوں، وہاں قدرتی طور پر کئی وفاداریاں وجود میں آتی ہیں۔ اور کئی وفاداریوں کے عملی نتیجہ ہی کا نام اختلاف اور انتشار ہے۔

اس کے برعکس جس معاشرہ میں تمام لوگ ایک خدا کے وفادار بن جائیں، وہاں

سب کا رخ صرف ایک مرکزی ہستی کی طرف ہو جاتا ہے۔ سب ایک رسی سے بندھ جاتے ہیں۔ اس طرح آپس کے اختلاف اور انتشار کے اسباب اپنے آپ ختم ہو جاتے ہیں۔

جو لوگ انفرادی قربانی کی سطح پر دین کو اختیار کر لیں، ان کی زندگی خدا رخی زندگی بن جاتی ہے۔ وہ اس شاہراہ پر چل پڑتے ہیں جو خدا کی قربت اور اس کی جنت کی طرف جانے والی ہے۔ ان کا سفر کبھی کھوٹا نہیں ہوتا، وہ کبھی راستہ کے دائیں بائیں نہیں مڑتے۔ وہ دین کے سیدھے راستے پر چلتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ خدا کی جنت میں پہنچ جاتے ہیں۔

اسلام کی آفاقیت

اسلام کی آفاقیت

اسلام کا آغاز ۶۱۰ء میں ہوا۔ اس وقت عرب کے شہر یثرب (مدینہ) میں دو قبیلے آباد تھے۔ ایک اوس اور دوسرے خزرج۔ یہ دونوں قبیلے ہمیشہ آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ مگر جب ایسا ہوا کہ ان پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دینِ توحید کی حقیقت کھلی اور وہ اسلام کے دائرہ میں داخل ہوئے تو ان کی آپس کی لڑائیاں ختم ہوگئیں۔ دو دشمن گروہ ایک دوسرے کے دوست گروہ بن گئے۔ جو لوگ اپنے اپنے ذاتی مفاد کے لئے آپس میں لڑتے رہتے تھے، وہ اب متحد ہو کر بلند تر انسانی مفاد کے مجاہد بن گئے۔

پہلے اور بعد میں یہ فرق کیوں ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پہلے دونوں قبیلے صرف اپنی اپنی بڑائی کو جانتے تھے۔ اوس کا قبیلہ خزرج پر بڑا بننے کی کوشش کرتا اور خزرج کا قبیلہ اوس کے اوپر بڑا بننا چاہتا۔ اس طرح دو بڑائیاں آپس میں ایک دوسرے سے ٹکراتی رہتی تھیں اور ان میں کبھی موافقت اور ہم آہنگی کی نوبت نہیں آتی تھی۔ مگر جب انھوں نے اسلام کے ذریعہ ایک خدا کی بڑائی کو دریافت کیا تو ان کی اپنی الگ الگ بڑائیاں ختم ہوگئیں اور صرف ایک سب سے اونچی بڑائی باقی رہی۔ پہلے دونوں قبیلے غیر مشترک بڑائیوں میں جی رہے تھے، اب دونوں ایک ہی مشترک بڑائی میں جینے

لگے۔ یعنی خدا کی بڑائی، جس سے بڑا اور کوئی نہیں۔

یہ ہے سب سے بڑی آفاقیت جو اسلام انسان کو عطا کرتا ہے۔ اسلام انسان کو توحید کا عقیدہ دیتا ہے۔ یعنی یہ کہ خدا ایک ہے۔ وہی سب کا خالق ہے۔ وہی سب کا مالک ہے۔ وہی سارے عالم کا نظام چلا رہا ہے۔ خدا ہی کے دئے سے آدمی کو ملتا ہے۔ خدا نہ دے تو کوئی شخص کچھ بھی نہیں پا سکتا۔ خدا لامحدود ہے اور بقیہ تمام چیزیں محدود۔ یہی توحید ہے، اور یہ توحید اسلامی آفاقیت کی بنیاد ہے۔

جب آدمی اس کامل توحید کو اختیار کرتا ہے تو اس کی نظر میں ساری بڑائی صرف ایک خدا کے لئے ہو جاتی ہے۔ بقیہ تمام چیزیں اس کی نظر میں یکساں ہو جاتی ہیں۔ انسانوں کے درمیان جو طرح طرح کے اونچ نیچ ہیں وہ اس کو مصنوعی نظر آنے لگتے ہیں۔ انسانوں کے درمیان جو مختلف قسم کی دیواریں اٹھا دی گئی ہیں وہ سب ڈھ جاتی ہیں۔ ذات اور رنگ اور نسل اور جغرافیہ اور اس قسم کی دوسری بنیادوں پر ایک انسان اور دوسرے انسان میں جو فرق کیا گیا ہے وہ سب مٹ جاتا ہے۔ ہر انسان بندہ بن جاتا ہے اور ایک خدا سب کا معبود۔

خدا کو پانے سے پہلے آدمی ایک انسان کو دوسرے انسان کی نسبت سے دیکھتا ہے۔ یہ چیز انسانوں میں تفریق کی ذہنیت پیدا کرتی ہے۔ کیوں کہ وہ پاتا ہے کہ بظاہر ایک انسان اور دوسرے انسان میں فرق ہے۔ کوئی کمزور ہے اور کوئی طاقت ور۔ کوئی غریب ہے اور کوئی دولت مند۔ کوئی چھوٹا ہے اور کوئی بڑا۔ مگر یہ تمام فرق صرف اس وقت تک ہیں جب تک انسان کو انسان کی نسبت سے دیکھا جائے۔ جب انسان کو خداوند عالم کی نسبت سے دیکھا جانے لگے تو سارے فرق اچانک ختم

ہو جاتے ہیں۔ کیوں کہ خدا کے مقابلہ میں کوئی طاقت ور نہیں، خدا کے مقابلہ میں کو
دولت مند نہیں۔

خدا تمام کائنات کا خالق و مالک ہے۔ خدا کے مقابلہ میں بڑا بھی اتنا ہی چھو
ہے جتنا کوئی چھوٹا۔ خدا کی عظمت اتنی زیادہ ہے کہ جب وہ سامنے آجائے تو اسر
کے مقابلہ میں تمام انسان اپنی عظمت کھو دیتے ہیں، اس کے بعد تمام کے تمام انسار
یکساں ہو کر رہ جاتے ہیں۔ سورج ظاہر نہ ہو تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ چراغ کم روشن
ہے اور سرچ لائٹ زیادہ روشن۔ مگر جب سورج اپنی تابانیوں کے ساتھ ظاہر ہو
تو چراغ اور سرچ لائٹ کا فرق مٹ جاتا ہے۔ اب ایک طاقت ور بلب بھی اتنا ہی
بے نور نظر آنے لگتا ہے جتنا ایک معمولی چراغ۔ سورج کے سامنے ایک اور دوسرے
میں کوئی فرق نہیں۔

توحید کا عقیدہ آدمی کے اندر یہی وسیع ذہن پیدا کرتا ہے۔ وہ ایک عظیم تر
بڑائی کے مقابلہ میں تمام دوسری بڑائیوں کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ اب ایسا ہو جاتا ہے
کہ جس خدا کی طرف ایک انسان دوڑتا ہے اسی خدا کی طرف سارے انسان دوڑنے لگتے
ہیں۔ جس خدا کے سامنے ایک انسان اپنی بڑائی کو چھوڑتا ہے۔ اسی کے سامنے تمام انسار
اپنی بڑائی کو چھوڑنے والے بن جاتے ہیں۔ توحید کے بغیر ہر انسان کی توجہ کا مرکز
الگ ہوتا ہے، توحید کے تحت ہر آدمی کی توجہ کا مرکز ایک ہو جاتا ہے۔ یہ بلاشبہ
سب سے بڑی آفاقیت ہے، اس سے بڑی آفاقیت اس دنیا میں کوئی اور نہیں
ہو سکتی۔

عرب قوم ہزاروں سال سے عرب کے جغرافیہ میں آباد تھی۔ مگر تاریخ میں اس کا

کوئی کارنامہ لکھا نہ جاسکا۔ اسلام سے پہلے عربوں کا حال یہ تھا کہ وہ شاعری کرتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر آپس میں لڑ جاتے تھے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا کہ ان کے درمیان ایک لڑائی چھڑتی تو وہ نسل در نسل سیکڑوں سال تک جاری رہتی۔ محدود دائرہ سے باہر اس وقت ان کی کوئی زندگی نہ تھی۔

مگر یہی عرب تھے کہ جب اسلام کے زیر اثر ان کے اندر فکری انقلاب آیا تو انھوں نے ایک عالمی تہذیب کی بنیاد ڈالی۔ وہ اپنے محدود جغرافیہ سے نکل کر سارے عالم میں پھیل گئے۔ جو لوگ اس سے پہلے ناقابل ذکر سمجھے جاتے تھے انھوں نے تمام قابل ذکر علوم میں اپنے وقت کی سب سے بڑی ترقیاں کیں۔ عربی زبان جو اس سے پہلے صرف ایک مقامی بولی کی حیثیت رکھتی تھی وہ ایک بین اقوامی زبان بن گئی۔ تنگ دنیا میں جینے والے وسیع تر دنیا کے مالک بن گئے۔

اس کی وجہ اسلام کی آفاقیت اور عالمگیریت تھی۔ اسلام نے ان کے بند ذہن کو کھول دیا۔ وہ نیچر کو پوجتے تھے، اسلام نے بتایا کہ نیچر مخلوق ہے اور بے بس ہے۔ پوجنے کے قابل تو صرف خدا کی ذات ہے جو تمہارا اور تمام دنیا کا مالک ہے۔ اس سے ان کے اندر یہ ذہن پیدا ہوا کہ نیچر جھکنے کی چیز نہیں ہے بلکہ ایسی چیز ہے جس کو جھکایا جائے، جس کی تحقیق اور تسخیر کی جائے۔ وہ انسان کو عرب اور عجم، کالے اور گورے، آزاد اور غلام، اونچی نسل اور نیچی نسل میں بانٹے ہوئے تھے۔ اسلام نے ان پر کھولا کہ تمام انسان ایک خدا کے بندے اور ایک آدم کی اولاد ہیں، ایک انسان اور دوسرے انسان میں کوئی فرق نہیں۔ اس سے ان کے اندر وہ عالمی اور آفاقی ذہن پیدا ہوا جس نے پوری دنیا کو اپنا وطن اور ساری انسانیت کو اپنا کنبہ سمجھ لیا۔ اسلام سے پہلے وہ دنیا سے الگ

کھلک ہو رہے تھے۔ اسلام کے بعد وہ ساری دنیا کے شریک اور ساتھی بن گئے۔

اسلام سے پہلے عرب کے لوگ قبائلی دور میں جی رہے تھے، اسلام کی بنیاد پر جب ان کے یہاں فکری انقلاب آیا تو اس نے ان کو ایک بین اقوامی گروہ بنا دیا۔ اس سے پہلے ان کی نظر چھوٹے چھوٹے مقاصد تک محدود تھی، اسلام کے بعد ان کی نگاہ میں اتنی وسعت پیدا ہوئی کہ وہ خشکی اور تری کو پار کرکے ساری دنیا تک وسیع ہوگئی۔ اسلام سے پہلے وہ کسی کو حقیر اور کسی کو معزز سمجھتے تھے، اسلام کے بعد تمام انسانی نسل یکساں طور پر ان کی نظر میں معزز اور محترم بن گئی۔ اس کے بعد کوئی پہاڑ نہ رہا جو ان کی نظر کو روکے اور کوئی سمندر نہ رہا جو ان کے سفر میں حائل ہو۔

اسلام نے عربوں کے اندر جب آفاقیت پیدا کی تو ان کا یہ حال ہوا کہ قبیلہ کی سرداری پر فخر کرنے والے لوگ عالم کے امام بن گئے۔ ان کے اندر ابن سینا اور الرازی جیسے ماہرین طب پیدا ہوئے جن کی طبی کتابوں کے یورپ کی زبان (لاطینی) میں ترجمے ہوئے اور یورپ کے میڈیکل کالجوں میں وہ بطور نصاب داخل کی گئیں۔ ان میں الادریسی جیسا جغرافیہ داں پیدا ہوا جس نے سسلی کے بادشاہ راجر دوم کے لئے سب سے پہلا دنیا کا نقشہ بنایا۔ ان میں ایسے ماہرین صنعت پیدا ہوئے کہ انگلینڈ کے بادشاہ اوفا رکس نے اپنے یہاں سونے کا سکہ ڈھالنے کے لئے بغداد سے سکہ گر بلائے۔

انھوں نے فن جہازرانی میں اتنی ترقی کی کہ ان کے یہاں احمد بن ماجد جیسا شخص پیدا ہوا جس نے واسکوڈی گاما کی بحری رہنمائی کی جو پندرہویں صدی عیسوی کے آخر میں یورپ اور ہندستان کے درمیان سمندری راستہ دریافت

کرنے کے لئے نکلا تھا۔ ان کے یہاں ابو عبیدہ مسلم البلنسی جیسے زمینی علوم کے ماہر پیدا ہوئے جن کی تحقیقات کو پڑھ کر کولمبس کے اندر یہ خیال پیدا ہوا کہ یہاں کچھ اور بھی دنیائیں ہیں جن کو اسے دریافت کرنا چاہئے۔ چنانچہ اسی شعور اور حوصلہ کے تحت وہ یورپ کے ساحل سے روانہ ہوا اور آخر کار نئی دنیا (امریکہ) کو دریافت کیا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام ایک کائناتی دین اور ایک آفاقی نظریہ ہے۔ اور اسلام کی بنیاد پر بننے والی تاریخ اس کی تائید کرتی ہے۔ اسلام کی آفاقیت صرف نظریاتی چیز نہیں، وہ ایک ثابت شدہ تاریخی حقیقت ہے۔ یہ ایسے اصول ہیں جو پوری طرح عمل کی صورت میں ڈھل چکے ہیں۔

اسلام کے آفاقی اصولوں کا بہت اچھا اظہار اس واقعہ میں ہوتا ہے جس کا تعلق ربعی بن عامرؓ اور رستم (ایرانی سردار) سے ہے۔ عرب جب قدیم ایران میں داخل ہوئے اور ایرانیوں کو ہر جگہ ان کے مقابلہ میں شکست کھانی پڑی، تو رستم نے گفت و شنید کے لئے اسلامی وفود کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دی۔ اس وقت جو لوگ رستم اور شاہ ایران کے دربار میں گئے، ان میں سے ایک ربعی بن عامر تھے۔ ربعی بن عامر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ رستم کے دربار میں پہنچے۔ رستم اس وقت ایرانی افواج کا سپہ سالار تھا۔ وہ اپنے شاندار دربار میں سونے اور جواہرات کا تاج پہنے ہوئے عالیشان تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔ اور ربعی بن عامرؓ معمولی کپڑے اور معمولی حالت میں تھے۔ رستم نے پوچھا کہ تم لوگ ہمارے ملک میں کیوں آئے۔ ربعی بن عامرؓ نے جواب دیا:

اللهُ ابتعثنا و اللهُ جاء بنا لنخرج من شاء من عبادة العباد الی عبادة

الله ومن ضيق الدنيا الى سعتها ومن جور الاديان الى عدل الاسلام

اللہ نے ہم کو بھیجا ہے اور اللہ ہم کو یہاں لے آیا ہے تاکہ جس کے بارہ میں وہ چاہے اس کو بندوں کی بندگی سے نکال کر خدا کی بندگی میں داخل کریں اور دنیا کی تنگی سے نکال کر اس کو اس کی وسعت میں پہنچادیں۔ اور مذاہب کی زیادتیوں سے چھٹکارا دے کر اس کو اسلام کے عدل وانصاف میں لے آئیں۔

ربعی بن عامرؓ نے اپنے اس قول میں نہایت مختصر طور پر مگر نہایت فصاحت کے ساتھ اسلام کے آفاقی اصولوں کو بیان کردیا ہے۔

اسلام کی تعلیمات کی بنیاد پر جب ایک شخص کے اندر فکری انقلاب آتا ہے تو وہ مخلوقات سے گزر کر خالق کو پالیتا ہے۔ وہ کائنات کے مالک کے ساتھ کھڑا ہو جاتا ہے جو تمام تنگیوں اور محدودیتوں سے بلند ہے۔ اس سے پہلے وہ بندوں کی سطح پر جی رہا تھا اب وہ خدا کی سطح پر جینے لگتا ہے جو تمام آفاق سے اوپر ہے۔ اس سے پہلے اگر وہ ایک خول کے اندر تھا تو اب وہ خول کے باہر کی وسیع دنیا میں اپنے لئے زندگی کے مواقع پالیتا ہے۔

عام حالت میں آدمی بندوں میں اٹکا ہوا ہوتا ہے۔ وہ اپنے ہی جیسے انسانوں کی طرف متوجہ رہتا ہے۔ وہ بس اپنے قدموں کے نیچے کی زمین کو جانتا ہے۔ مگر جب وہ خدا کو پاتا ہے اور خدا کا عبادت گزار بنتا ہے تو وہ انسانوں سے اوپر اٹھ جاتا ہے۔ انسانی دوستیاں اور دشمنیاں اس کی نظر میں حقیر بن جاتی ہیں۔ وہ انسانی شکایتوں اور انسانی محبتوں سے گزر جاتا ہے۔ اس کی روح لامحدود پنہائیوں میں سفر کرنے لگتی ہے جہاں چھوٹی چھوٹی چیزوں میں اُلجھنے کا کوئی سوال ہی نہیں۔

خدا کو پانے سے پہلے آدمی دنیا کی محدودیتوں میں گم رہتا ہے۔ خدا کو پانے کے بعد وہ دنیا کی محدودیتوں سے آگے نکل جاتا ہے۔ وہ اپنی آرزوؤں اور اپنے حوصلوں کی تسکین کے لئے ایک بلند تر سطح پالیتا ہے۔ یہ وہ دنیا ہے جہاں کھونا بھی پانا بن جاتا ہے۔ جہاں ناخوش گواریاں بھی خوش گواریوں میں ڈھل جاتی ہیں۔ جہاں غم بھی اتنا ہی اہم بن جاتا ہے جتنا خوشی اور مسرت۔

پھر اسلام آدمی کو انسانی موشگافیوں والے دین سے نکالتا ہے۔ وہ آدمی کو جھوٹے رسم و رواج والے مصنوعی دین سے باہر لاتا ہے۔ وہ اس کو اس سچے دین سے آشنا کرتا ہے جہاں ایک طرف انسان ہوتا ہے اور دوسری طرف خدا۔ جہاں خدا اور بندے کے درمیان کوئی دوسری چیز حائل نہیں، جہاں خدا سے ملنے کے لئے رسم و رواج کے بندھنوں میں اپنے کو باندھنے کی ضرورت نہیں۔

خدا ہر آن اپنے بندوں تک پہنچا ہوا ہے، اسی طرح خدا کے بندے بھی ہر آن خدا تک پہنچ سکتے ہیں۔ خدا اور بندے کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں، اس لئے خدا اور بندے کے ملاپ کے لئے کسی درمیانی واسطہ کی ضرورت بھی نہیں۔ انسان جب اس ابدی دنیا میں پہنچتا ہے تو وہ خدا کو بھی عین اسی مقام پر پالیتا ہے جہاں وہ خود کھڑا ہوا ہے۔

اسلام توحید کا دین ہے۔ اسلام میں خدا ایک ہے اور ساری خدائی بھی اسی ایک ذات کو حاصل ہے۔ جو لوگ اس خالص توحید کو پالیں وہ ایسی لامحدود دنیا میں پہنچ جاتے ہیں جہاں آفاقیت ہی آفاقیت ہے، اور جہاں ابدیت ہی ابدیت۔

مصنّف کی دوسری تصنیفات

اُردو مطبوعات

اللہ اکبر
تذکیر القرآن
الاسلام
عظمتِ قرآن
مذہب اور جدید چیلنج
ظہور اسلام
احیاءِ اسلام
پیغمبرِ انقلاب
سوشلزم اور اسلام
صراطِ مستقیم
اسلامی زندگی
اسلام اور عصر حاضر
رازِ حیات
حقیقتِ حج
خاتونِ اسلام
تعبیر کی غلطی
تبلیغی تحریک
دین کیا ہے
قرآن کا مطلوب انسان
تجدیدِ دین
اسلام، دینِ فطرت
تعمیرِ ملت
تاریخ کا سبق
مذہب اور سائنس
عقلیاتِ اسلام
فسادات کا مسئلہ
انسان اپنے آپ کو پہچان
اسلام پندرھویں صدی میں
راہیں بند نہیں
ایمانی طاقت
اتحادِ ملت
سبق آموز واقعات
زلزلۂ قیامت
حقیقت کی تلاش
پیغمبرِ اسلام
آخری سفر
تعارفِ اسلام
تعلیماتِ اسلام
اسلامی دعوت
خدا اور انسان
حل یہاں ہے
سچا راستہ
دینی تعلیم
حیاتِ طیبہ
باغِ جنت
نارِ جہنم
دین کی سیاسی تعبیر

عربی مطبوعات

الاسلام يتحدى
الدين في مواجهة العلم
حكمة الدين
الاسلام والعصر الحديث
مسئوليات الدعوة
نحو تدوين جديد للعلوم الاسلامية
امكانات جديدة للدعوة
الشريعة الاسلامية وتحديات العص
المسلمون بين الماضي والحال والمستقب
نحو بعث اسلامي
وجوب تطبيق الشريعة الاسلامي
العلم على خطى الدين
لابد من الثورة الفكرية قبل الثورة التشريعية
القرآن في مواجهة التحديات العصر

ہندی مطبوعات

انسان اپنے آپ کو پہچان
منزل کی اور
نویگ کے پرویش دوار پر
سچائی کی کھوج

انگریزی مطبوعات

luhammad: The Prophet of Revolution
iod Arises
lan! Know Thyself
luhammad: The Ideal Character
he Way to Find God
he Teachings of Islam
he Good Life
he Garden of Paradise
he Fire of Hell
abligh Movement
slam in Harmony with Human Nature
he Final Destination
lo End to Possibilities
The Achievement of Islamic Revolution
Religion and Science
The Prophet and his Companions